فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۹۷

از جنوری ۱۹۶۶ء تا جون ۱۹۶۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

جلد ٩٧

از جنوری ١٩٦٦ء تا جون ١٩٦٦ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۹۷ - ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۶ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

آگرہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی نے "سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کر کے ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، جو اب کتاب کی شکل میں بال کرشن بک کمپنی، حضرت گنج لکھنؤ سے شائع ہوا ہے، اس کے نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ مصنف نے سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کے مسلمان مجددوں کی مذہبی تحریکوں کا تحقیقی جائزہ لیا ہوگا، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اصلی مقصد حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلاف زہر افشانی ہے، جس سے عام مسلمانوں اور خصوصاً حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عقیدتمندوں اور ان کے مسلک کے پیرووں کی پوری دل آزاری اور ایذا رسانی ہوتی ہے، مصنف نے اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے تاریخی تحقیقات کی آڑ لی ہے، لیکن ان کی تحقیقات کی حیثیت وہی ہے جو کسی وکیل کے جھوٹے مقدمہ کی شہادتوں کی پرفریب ترتیب کی ہوا کرتی ہے۔

چشتیہ اور سہروردیہ سلسلہ کے صوفیائے کرام اور دوسرے بزرگان دین پر جا بجا نیش زنی کر کے مصنف نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا یہ مرقع پیش کیا ہے کہ "موجودہ دور کے مصنفوں نے ان کو ایک خرافاتی شخصیت بنا دیا ہے، انھوں نے صرف فرقہ وارانہ جذبات سے اپیل کی ہے، انھوں نے اپنے اور اپنے جانشینوں کے لیے قیوم ہونے کا دعویٰ کیا، اور اسی کی شہرت دیتے رہے، انھوں نے اپنے مجدد اور قیوم ہونے کے دعویٰ کی بنیاد اپنے انکشافات اور الہامات ہی پر رکھی جس کو ان کے سریع الاعتقاد

مقلدوں کے تنگ دائرہ ہی میں قبول کیا گیا، ان کے اس دعویٰ میں کہ وہ مجدد اور قیوم ہیں، ایک کورانہ توہم پرستی کی جھلک ہے، ان کی تحریک ایک ہیجانی تحریک تھی، ۱۶۶۸ء میں شیخ محمد معصوم کی وفات سے مجددی رہی سہی عزت کا شائبہ بھی جاتا رہا، مجدد کے پوتوں کو انتشار اور اخلاقی بدحالی کا لپیگ ہا، ان میں سب ہی قطب اور قیوم کی حیثیت اختیار کرنا چاہتے تھے، اورنگ زیب جیسے راسخ العقیدہ شہنشاہ کی طویل حکومت کے زمانے میں مسلمانوں کی زندگی میں جو اختلال و انتشار رہا اس سے مجدد کے مسلک کا یہ کھوکھلاپن ظاہر ہو گیا کہ اگر حکمرانوں کو راسخ العقیدگی کی طرف مائل کیا جائے تو ساری برائیاں دور ہو سکتی ہیں"، ان فقروں کو مشتے از خروارے سمجھنا چاہیے۔

اسی ہندوستان میں اب تک تاریخی تحقیقات کے کیا کیا نمونے پیش نہیں کیے جا چکے ہیں، بڑی تحقیقی کاوش سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ رامائن میں رام چندر اور سیتا جی کی کہانی فرضی ہے، جو مصر کے کسی افسانے سے لی گئی ہے، یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کربلا میں نہیں ہوئی، بلکہ ان کی طبعی وفات قسطنطنیہ میں ہوئی، یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ شیوا جی شاہ جی کے بجائے کسی اور کا لڑکا تھا، اب پوری تحقیقی سرگرمیاں اس میں صرف ہو رہی ہیں کہ قطب مینار، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی وغیرہ مغلوں کی نہیں بلکہ راجپوتوں کی بنائی ہوئی ہیں، ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی کی کتاب بھی اسی قسم کی تحقیقات کا نمونہ ہے، جنوبی ہند کے ایک ہندو مورخ کے بیان کے مطابق اس قسم کی تحقیقات سے ہندوستانی علم و فن محض رسوا اور بدنام ہو کر رہ جاتا ہے،

۱۹۳۵ء میں انگریزی میں ایک کتاب "دی ریل سیوا جی" شائع ہوئی تھی، اس کے مصنف سید تفضل داؤد سعید خاں کو بھی دعویٰ تھا کہ انھوں نے سیوا جی کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ ناقابل تردید تحقیقاتی حقائق پر مبنی ہے، لیکن اس کتاب سے ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوتے تھے، اس لیے یو پی کی حکومت نے اس کی اشاعت ممنوع قرار دیدی جس کے بعد مصنف کو یو۔ پی سے جلاوطن بھی ہونا پڑا، ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی

نے اپنی کتاب جذباتی آہنگی اور قومی یگانگت کا نعرہ بلند کرتے ہوئے پیش کی ہے خواہ اس سے تمام مسلمانوں کی دل آزاری کیوں نہ ہو، لیکن جذباتی آہنگی اور قومی یگانگت کے بہی خواہوں کو اصلی و نقلی اور دانا و نادان دوستوں میں تفریق کرنا ضروری ہے، تاکہ یہ تحریک صحیح معنوں میں پروان چڑھے۔

اس کتاب کے شروع میں پروفیسر محمد حبیب (سابق استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا پیش لفظ بھی ہے، جس میں مصنف کو مولانا عبد الحق محدث دہلوی سے بھی زیادہ بہتر مصنف اور محقق سمجھنے پر مجبور ہوئے ہیں، اور وہ خوش ہیں کہ اس کے مصنف نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حضرت احمد سرہندیؒ نے خود مجدد الف ثانی کا لقب اختیار کر لیا تھا، گرچہ وہ کسی معنی میں بھی مجدد نہ تھے، اسی طرح انھوں نے اپنے کو خود ساختہ قیوم (خدا کا ایجنٹ) بنا رکھا تھا، ان کی سیاسی خدمات محض خرافاتی افسانے ہیں جن کو ایسے اہل قلم نے گھڑ رکھا ہے جو تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں، پروفیسر صاحب نے اپنی سند میں مصنف کو البیرونی، بو علی سینا، ابن عربی، شیخ نظام الدین اولیا، اور دارا شکوہ کی صف میں بھی لاکر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ موجودہ دور میں ان سب میں ان کو عظیم ترین سمجھنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، یقین نہیں آتا کہ یہ ساری باتیں پروفیسر محمد حبیب کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں، اور اگر واقعی ان ہی کی ہیں تو معلوم نہیں ان سے مصنف کی شہرت میں اضافہ ہوگا یا پروفیسر صاحب کی فکر و نظر بھی مصنف کی کتاب کی طرح ایک مستقل موضوع بن جائے گی۔

دار المصنفین کی مطبوعات کی قیمت اب تک وہی تھی جو آج سے پچاس سال پہلے رکھی گئی تھی، ۲۶×۲۰/۸ کے سو صفحے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ کے حساب سے پوری کتاب کی قیمت رکھی جاتی تھی، کاغذ، لکھائی چھپائی کے سامان کی گرانی کی وجہ سے اب ڈیڑھ روپیہ کے بجائے ۲ دو روپیہ کر دی گئی ہے، اسی کے ساتھ کمیشن بڑھا کر ۳۳ فی صدی کر دیا گیا ہے، تاکہ تاجروں اور عام خریداروں کو خریداری میں آسانی ہو۔

مقالات

امام عبد القاہر بغدادیؒ

از

(جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش)

مذاہب اسلام کی تاریخ و تفصیل کے موضوع پر عام طور سے شہرستانی کی کتاب "الملل والنحل" مشہور ہے، مگر اس کا ماخذ امام ابو منصور عبد القاہر بن طاہر البغدادیؒ کی "کتاب الفرق بین الفرق" ہے، جو اپنے تشدد اور لہجہ کی تلخی کی بنا پر خاص شہرت رکھتی ہے، خود مصنف علیہ الرحمہ بھی اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے، ذیل میں ان کے حالات زندگی اور "الفرق بین الفرق" نیز ان کی دوسری تصنیف "اصول الدین" کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

نام و نسب — عبد القاہر نام اور ابو منصور کنیت تھی، پدر بزرگوار کا نام ابو عبد اللہ طاہر بن محمد التمیمی تھا۔[1]

خاندان اور وطن — امام عبد القاہر کی نسبت "التمیمی" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرب تھے۔ تعجب ہے سارٹان نے انھیں کس طرح اپنے "مقدمۂ تاریخ سائنس" میں ایرانی بتا دیا، جیسا کہ پرنسپل عبد الرحمن خاں مرحوم نے "قرون وسطی کے مسلمانوں کی علمی خدمات" میں لکھا ہے:

"دوسرے ایرانی حکماء میں ابن طاہر (ابو منصور عبد القاہر بن طاہر البغدادی) کو شیاد بن لبان ...... تھے۔"[2]

---

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث صفحہ ۲۳۸، تبیین کذب المفتری لابن عساکر صفحہ ۲۵۳، فوات الوفیات لابن شاکر الکتبی جلد اول صفحہ ۲۵۸، مرآۃ الجنان جلد ثالث ص ۵۲ [2] "قرون وسطی کے مسلمانوں کی علمی خدمات" ج ۱ ص ۱۷۳

بہرحال وہ عرب نژاد تھے، وطن بغداد تھا، وہیں پیدا ہوئے، بعد میں ان کے والد ابوعبداللہ طاہر بن محمد انھیں لیکر نیشاپور چلے آئے، جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا۔ امام سبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے:۔

ورد نیسابور مع ابیہ ابی عبداللہ طاہر[1]	اپنے پدر بزرگوار ابی عبداللہ طاہر کے ہمراہ نیشاپور آئے۔

امام عبدالقاہر کا خاندان دولت وحشمت کے لحاظ سے بھی ممتاز تھا، مگر انھوں نے اس مال و ثروت کو عیش پرستی اور اسراف بیجا کے بجائے علما و فضلا، بالخصوص محدثین کی خدمت میں صرف کیا، حتیٰ کہ اسی جود و سخا کے نتیجے میں خود فقیر ہوگئے۔ ابن شاکر کتبی نے "فوات الوفیات" میں لکھا ہے:

ورد مع ابیہ نیسابور، کان ذا مال	اپنے والد کے ہمراہ نیشاپور آئے، بڑے دولتمند
وثروۃ وانفقہ علی اہل العلم	تھے، مگر ساری دولت علما و محدثین پر خرچ
والحدیث"[2]	کردی۔

اسی طرح ابن عساکر نے شیخ عبدالغافر کے "ذیل تاریخ نیسابور" سے نقل کیا ہے۔

وتفقہ علی اہل العلم والحدیث	انھوں نے علما و محدثین سے علم حاصل کیا اور
وانفق مالہ علی اہل العلم	ان کے صاحبزادے نے علما پر اپنی دولت
حتی افتقر[3]	صرف کردی یہانتک کہ خود فقیر ہوگئے۔

تعلیم واساتذہ ابتدائی تعلیم بغداد میں ہوئی، اعلیٰ تعلیم نیشاپور اور اسفرائن جاکر حاصل کی، اس زمانہ میں استاذ ابواسحاق اسفرائنی فقہ اور کلام میں سرآمد فضلائے دہر سمجھے جاتے تھے، امام عبدالقاہر بھی ان کی خدمت میں پہنچے اور زانوئے تلمذ تہ کیا، ابن عساکر نے لکھا ہے:

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث صفحہ ۲۳۸ نیز فوات الوفیات و تبیین کذب المفتری [2] ایضاً جزوی اختلافات کے ساتھ [3] تبیین کذب المفتری صفحہ ۲۵۴

وکان قد درس علی الاستاذ	اور انھوں نے استاذ ابواسحاق اسفرائنی
ابی اسحاق الاسفرائنی[1]	سے تعلیم حاصل کی

حدیث انھوں نے اپنے عہد کے مشاہیر محدثین سے پڑھی تھی، جن میں عمرو بن نجید، ابوعمر محمد بن جعفر بن مطر، ابوبکر الاسماعیلی اور ابوبکر بن عدی خاص طور سے مشہور ہیں،[2]

درس و تدریس امام ابواسحاق اسفرائنی نے ۴۱۸ھ میں وفات پائی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے معتقدین نے امام ابومنصور عبدالقاہر ہی کو ان کی جانشینی کے لیے منتخب کیا، خود امام ابواسحاق نے اپنی زندگی میں انھیں درس و تدریس کی اجازت دیدی تھی، اور ان کے سامنے ہی دو سال تک وہ یہ فریضہ انجام دے چکے تھے، ابوبکر بن ہدایت اللہ الحسینی نے "طبقات الشافعیہ" میں لکھا ہے:

اشتغل بہا بالدرس علی الاستاذ	وہاں وہ استاذ ابواسحاق اسفرائنی
ابی اسحاق الاسفرائنی الی ان	سے استفادہ میں مشغول رہے، یہانتک
صار بارعاً عامیرا ۔۔۔۔۔۔۔	کہ مختلف علوم میں درجہ کمال کو پہنچ گئے۔۔۔۔
واجاز لہ الاستاذ بعدہ	۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد استاد نے انھیں
بالاملاء فاملی سنتین[3]	درس و تدریس کی اجازت دیدی تو دو سال
	تک وہاں پڑھاتے رہے۔

بہرحال امام ابواسحاق اسفرائنی کے بعد امام عبدالقاہر ان کے جانشین ہوئے اور تقریباً دس سال تک مسجد عقیل میں درس و افادہ میں مشغول رہے، ابن عساکر نے عبدالغافر کی "ذیل تاریخ نیساپور" سے نقل کیا ہے:

[1] تبیین کذب المفتری صفحہ ۲۵۴، نیز طبقات الشافعیہ للسبکی و فوات الوفیات [2] طبقات الشافعیہ للسبکی ص ۲۳۸ [3] طبقات الشافعیہ لابی بکر بن ہدایت اللہ الحسینی ص ۴۲

واقعد لا بعد لا فی مسجد عقیل للاملاء مکانه واملی سنین[1]	اپنے بعد انھوں نے امام عبد القاہر کو مسجد عقیل میں پڑھانے کے لیے بٹھا دیا جہاں وہ کئی سال تک پڑھاتے رہے۔

خراسان کے اکثر علما، ان کے شاگرد تھے۔

وحمل عنه العلم اکثر اهل خراسان[2]	خراسان کے اکثر علما نے ان سے علم حاصل کیا۔

ان کے علم و فضل کا شہرہ سن کر بڑے بڑے ائمۂ فن ان سے استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے، ان میں امام ناصر المروزی اور استاذ ابو القاسم القشیری جیسے جلیل القدر فضلائے روزگار بھی تھے،

واختلف الیه الائمة وقرؤا علیه مثل ناصر المروزی وابی القاسم القشیری وغیرهما[3]	اور اکثر ائمۂ علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور علم حاصل کرتے تھے، جیسے امام ناصر المروزی اور استاذ ابو القاسم القشیری وغیرہما۔

جامعیت امام عبد القاہرؒ کسی ایک ہی فن کے باکمال امام نہیں تھے، بلکہ سترہ علوم میں درس دیتے تھے۔

وکان یدرس فی سبعة عشر فنا[4]	اور وہ سترہ علوم میں درس دیا کرتے تھے۔

البتہ فقہ، اصول فقہ، فرائض و حساب، علم کلام، نحو اور عروض میں ید طولیٰ حاصل تھا، فقہ میں بعض منفرد رائیں رکھتے تھے، تعجب ہے کہ امام سبکی نے "لف حریر" کا مسئلہ انکی جانب منسوب کیا ہے[5]۔ علم کلام میں ان کی کتاب "اصول الدین" مخصوص اہمیت رکھتی ہے اور "الفرق بین الفرق" تو کلاسکی حیثیت کی حامل ہے، حساب میں ان کا "تکملہ" عرصہ تک اہل فن میں مستند سمجھا جاتا تھا۔

آخری زمانہ اور وفات امام عبد القاہر بغدادی کا آخری زمانہ بڑے سیاسی انتشار و پراگندگی کا تھا۔

---

[1] تبیین کذب المفتری ص ۲۵۴، فوات الوفیات ج ۱ ص ۲۹۹، طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۸ [2] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۸ [3] ایضاً نیز فوات الوفیات و مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۵۲ [4] طبقات الشافعیہ للسبکی و طبقات الشافعیہ لابی بکر بن ہدایت اللہ الحسینی، و فوات الوفیات تبیین کذب المفتری [5] طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۳ ص ۲۳۹

سلطان محمود غزنوی کا جس نے خراسان میں ایک مستحکم حکومت قائم کی تھی، ۴۲۱ھ میں انتقال ہوگیا، اس کے بعد پہلے اس کا بیٹا محمد اور پھر کچھ دن بعد دوسرا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہوا، اس زمانہ میں سلجوقی ترکوں کی چیرہ دستی اور سرکشی سے ماوراء النہر اور خراسان کا امن و امان مختل ہو رہا تھا، سلطان مسعود اور اس کے اعیان لشکر کی سعی پیہم کے باوجود سلاجقہ کی طاقت بڑھتی ہی رہی اور آخر کار انھوں نے مرو میں اپنے قدم جما لیے، اگلے سال وہ نیسا پور پر بھی قابض ہوگئے، اور رمضان ۴۲۹ھ کے پہلے جمعہ کو طغرل بیگ تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔

اس نئے انقلاب سے نیشا پور میں جو مصیبت آئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ طغرل کے وہاں متمکن ہونے کے بعد اس کے بھائی داؤد نے شہر کو لوٹنے کا ارادہ کیا، پہلے طغرل نے رمضان کی حرمت کا خوف دلا کر اسے روک دیا، مگر جب رمضان گزر گیا تو داؤد پھر غارت گری پر مصر ہوا، طغرل نے بہت کچھ سمجھایا، خلیفہ کے ایلچی جو سلاجقہ کے لیے پروانہ حکومت لیکر آئے تھے، سمجھاتے تھے، مگر داؤد کسی طرح باز نہیں آتا تھا، آخر کار طغرل نے دھمکی دی کہ اگر تم اس ارادے سے باز نہ آئے تو میں خودکشی کر لوں گا، اس طرح نیشاپور اس مصیبت سے بچا، ابن الاثیر لکھتا ہے،

وخاطب داؤد طغرل بک فی نهب البلاد فمنعه فامتنع واحتج بشهر رمضان، فلما انسلخ رمضان صمم داؤد علی نهبه فمنعه طغرلبک واحتج علیه برسل الخلیفه وکتابه فلم یلتفت داؤد الیه وقوی عزمه علی النهب فاخرج	داؤد نے طغرل بیگ سے شہر لوٹنے کے بارے میں گفتگو کی، مگر اس نے رد کر دیا اور وہ رک گیا اور اس نے ماہ رمضان کی حرمت کا خوف دلایا، جب رمضان گزر گیا تو داؤد نے شہر لوٹنے کا پختہ ارادہ کیا، اس پر طغرل نے اسے روکا اور خلیفہ کے ایلچیوں کی موجودگی سے شرم دلائی مگر داؤد نے اس کی پروانہ کی اور

طغول بك سكينا وقال له والله لئن نهبت شيئاً لاقتلن نفسي فكف عن ذالك[1]

لوٹ مار کے لیے آمادہ ہو گیا تب طغرل بیگ نے چھری نکال لی اور داؤد سے کہا خدا کی قسم اگر تونے ذرا بھی لوٹ مار کی تو میں خودکشی کر لوں گا تب جاکر وہ کہیں رکا۔

ظاہر ہے جب یہ متوحش خبریں اہالی نیشاپور کو پہنچی ہوں گی تو وہ کس طرح فرار پر قرار کو ترجیح دے سکتے تھے، چنانچہ شہر ویران ہونے لگا۔ اسی انتشار و پراگندگی کے زمانہ میں امام عبدالقاہر بھی نیشاپور سے جو ان کا وطن مالوف بن چکا تھا، مفارقت کرنے پر مجبور ہوئے، سبکی نے امام ابوعثمان الصابونی سے نقل کیا ہے:

ومن حسرت نیسابور اضطرار مثله الى مفارقتها[2]

اور نیشاپور کی بدقسمتی تھی کہ امام عبدالقاہر جیسا عالم وہاں سے ترک وطن پر مجبور ہوا۔

اور اس کی توجیہ میں لکھا ہے:

قلت فارق نیسابور بسبب فتنة وقعت بها من التركمان[3]

میں کہتا ہوں انھوں نے نیشاپور سے سلجوقیوں کے فتنہ کے خوف سے مفارقت کی۔

بہرحال وہ نیشاپور سے اسفرائن پہنچے جو ان کے استاذ کا وطن اور آخری آرام گاہ تھا، یہاں وجوہ و اعیان شہر نے ان کے ورود مسعود کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا، سبکی نے لکھا ہے:

لما حصل ابو منصور باسفرائن ابتهج الناس بمقدمه الى الحد

جب امام ابومنصور اسفرائن پہنچے تو ان کے آنے سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ بیان

[1] کامل لابن الاثیر جلد تاسع ص ۱۶۲ [2] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۸ [3] ایضاً

الذی لا یوصف[1]

نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن ایک تو پیرانہ سالی میں وطن سے مفارقت، پھر اسفرائن کی آب و ہوا جو ویسے بھی مرطوب تھی[2] جو آخر کار ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ابن عساکر نے ان کے اسفرائن پہنچنے کے ذکر کے فوراً بعد لکھا ہے:

فلم یبق الا الیسیر حتی مات[3]

کچھ ہی دن وہاں رہے تھے کہ انتقال فرمایا۔

آخری عزت افزائی جو اعیان شہر نے اس امام والامقام کی فرمائی یہ تھی کہ وفات کے بعد انھیں ان کے استاذ ابواسحٰق اسفرائنی کے مزار فائز الانوار کے برابر دفن کیا، حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے:

واتفق اهل العلم على دفنه بجنب ابی اسحٰق ابراهیم بن محمد المتکلم الاسفرائنی۔ فقبراهما متجاوران تجاور تلاصق کانهما نجمان جمعهما مطلع وکوکبان ضمهما برج مرتفع[4]

اہل علم کا اتفاق ہوا کہ وہ امام ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد المتکلم الاسفرائنی کے پہلو میں دفن کیے گئے، ان دونوں کی قبریں بالکل ملی ہوئی ہیں، گویا کہ وہ دو ستارے ہیں جو ایک مطلع میں جمع ہو گئے ہیں یا دو سیارے ہیں جو ایک برج عالی میں ملے ہوئے ہیں۔

اعزہ و اقارب تاریخ میں امام ابومنصور کی کسی اولاد و زینہ کا ذکر نہیں ملتا، انکی صاحبزادی انکے شاگرد رشید امام ابوالمظفر اسفرائنی کے حبالۂ عقد میں تھیں، انہی سے اولاد چلی جو بعد میں بلخ کے شرفاء میں محسوب ہوتی تھی، شیخ زاہد الکوثری نے التبصیر فی الدین کے مقدمہ میں لکھا ہے:

وکان له (للامام ابی مظفر الاسفرائنی) اتصال مصاهرة بالاستاذ ابی منصور البغدادی الامام

امام ابوالمظفر الاسفرائنی کا استاذ ابی منصور بغدادی سے سسر داماد کا رشتہ تھا، ان کی اولاد بھی ہوئی تھی جو بلخ کے

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۸ [2] جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۲۰۱ [3] تبیین کذب المفتری ص ۲۵۳ [4] ایضاً

عربی	اردو
وولد له النسل المباس ك	مشاہیر شرفا میں محسوب ہوتی تھی، اور
كانوا وجوه اهل بلخ المشهورين	وہاں کے صف اول کے علماء و ائمہ میں
المعروفين بها والمتقدمين من	سمجھی جاتی تھی۔
علمائها وائمتها [1]	

ابوبکر الحسینی نے ان کے ایک بھائی کا بھی ذکر کیا ہے جو نظامیہ بلخ میں مدرس تھے:

عربی	اردو
وكان لابي منصور هذا اخ يقال	ان امام منصور کے ایک بھائی بھی تھے جن کا
له ابو القاسم عبدالله كان اماما	نام ابوالقاسم عبداللہ تھا، وہ متعدد علوم
ذا علوم متعددة وجاه عريض	کے صاحب کمال عالم تھے، جاہ و ثروت کے ساتھ
ومال كثير وسخاء واسع نزل بلخ	ممتاز تھے، بڑے سخی تھے، بلخ میں آباد ہوگئے تھے
ودرس بنظاميتها ومات بها [2]	اور وہاں کے مدرسہ نظامیہ میں پڑھاتے تھے،
	وہیں انھوں نے وفات پائی۔

جلالت قدر امام ابو منصور عبد القاہر البغدادی مشاہیر علمائے اسلام میں محسوب ہوتے تھے، ان کے والد ابوالمظفر الاسفرائنی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

عربی	اردو
ولو لم يكن لاهل السنة والجماعة	اور اگر اہل السنت والجماعت کے یہاں امام
من مصنف لهم في جميع العلوم	ابو المنصور عبد القاہر بن طاہر بن محمد بغدادی
على الخصوص والعموم الا من	کے علاوہ اور کوئی عالم و مصنف نہ ہوتا تو بھی
كان فريد زمانه وواحد اقرانه	تنہا وہ کافی تھے، وہ اپنے زمانہ میں یکتا تھے،
في معارفه وعلومه وكثرة القاله	اور علوم و معارف نیز تصانیف مفیدہ کے

[1] التبصیر فی الدین مقدمہ ص ۶ [2] طبقات الشافعیہ لابی بکر بن ہدایت اللہ الحسینی ص ۱۴۴

عربی	اردو
من تصانيفه وهو الامام ابو منصور	باب میں اپنے معاصرین میں منفرد تھے،
عبدالقاهر بن طاهر بن محمد	کوئی ایسا علم نہیں ہے جس میں ان کی
البغدادي التميمي قدس الله	تصانیف نہ ہوں۔
روحه وما من علم من العلوم	
الا وله فيه تصانيف [1]	

حافظ ابن عساکر نے ان کے فضل و کمال کے بارے میں لکھا ہے:

عربی	اردو
كان من ائمة الاصول وصدور	امام عبدالقاہر کے متعلق اہل فضل و علمائے محصلین
الاسلام باجماع اهل الفضل	کا اجماع ہے کہ وہ ائمہ اصول اور صدور
والتحصيل بديع الترتيب	اسلام میں سے ایک ہیں، ترتیب ان کی
غريب التاليف والتهذيب	نہایت عمدہ اور تالیف عجیب ہوتی تھی،
يراه الجلة صدرا مقدما	اکثر لوگوں کی ان کے بارے میں رائے ہے کہ
ويدعوه الائمة اماما مفخما [2]	وہ صدر و پیشوا تھے، اور ائمہ فن ان کو
	"امام مفخم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امام سبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے:

عربی	اردو
الامام الكبير الاستاذ ابو منصور	امام کبیر استاذ ابو منصور بغدادی عظیم المرتبت
البغدادي امام عظيم القدر	جلیل القدر اور وسیع العلم امام تھے، فقہ
جليل المحل كثير العلم لا سيما	اصول فقہ، فرائض، حساب اور علم کلام
في الفقه واصوله والفرائض	میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، ان کا نام

[1] التبصیر فی الدین ص ۱۲۰ [2] تبیین کذب المفتری ص ۲۵۳

والحساب وعلم الکلام اشتهر اسمه وبعد صيته وحمل عنه العلم اکثر اهل خراسان[1]

مشہور ہے، اور ان کی شہرت دور دور پہنچی ہوئی ہے، اکثر اہل خراسان نے ان سے علم حاصل کیا۔

دوسری جگہ انھوں نے عبد الغافر (صاحب ذیل تاریخ نیشاپور) کا قول نقل کیا ہے:

الاستاذ الامام الکامل ذو الفنون الفقیه الاصولی الادیب الشاعر النحوی الماهر فی علم الحساب العارف بالعروض[2]

وہ استاذ امام کامل فنون فقہ کے واقف کار ماہر اصول، ادیب، شاعر نحوی، علم حساب میں ماہر اور علم عروض کی معرفت رکھنے والے تھے۔

اسی طرح امام فخر الدین الرازی نے "الریاض المونقہ" میں ان کی جلالت قدر کے بارے میں لکھا ہے:

کان یسیر فی الرد علی المخالفین سیر الرجال فی الامال وکان عادته العلم فی الحساب المقدم والکلام والفقه والفرائض واصول الفقه ولو لم یکن له الا کتاب التکملة فی الحساب لکفاه[3]

مخالفین کی تردید میں بلائے بے درماں تھے، علم الحساب مساحت، علم کلام، فقہ، فرائض، اصول فقہ میں باکمال تھے، اور اگر انکی تصانیف میں سوائے "کتاب التکملہ" کے جو فن حساب میں ہے، اور کوئی کتاب نہ بھی ہوتی تب بھی یہ انکی شہرت و عزت کے لیے کافی تھی۔

ابن شاکر الکتبی نے "فوات الوفیات" میں لکھا ہے:

کان ماهراً فی فنون عدیدة خصوصاً علم الحساب فانه کان

وہ متعدد فنون میں ماہر تھے، بالخصوص علم حساب میں، اس میں انھیں مرتبۂ اتقان حاصل تھا،

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۸ [2] ایضاً ص ۲۳۸ [3] ایضاً ص ۲۳۸

متقنناً وله فیه تالیف نافعة منها کتاب التکملة وکان عارفاً بالفرائض والنحو[1]

ان کی اس علم میں بہت سی مفید تصانیف ہیں جن میں سے کتاب التکملہ بھی ہے، وہ فرائض اور نحو میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے۔

امام ابو اسحٰق الشیرازی نے "طبقات الفقہاء" میں ان کا مستقل تذکرہ نہیں دیا ہے، حضرت شافعی فقہاء کے تذکرے کے آخر میں اتنا لکھا ہے:

"وبخراسان وما وراء النهر من اصحابنا خلق کثیر کالدونی .... والی منصور البغدادی .... وناصر المروزی"[2]

عہد حاضر میں سارٹن نے انھیں گیارہویں صدی مسیحی کے نصف اول کے مشاہیر فضلا میں محسوب کیا ہے:

"دنیا کے علم و حکمت کے علمبردار ان دنوں مسلمان ہی تھے .... دوسرا ایرانی حکماء میں ابن طاہر (امام ابو منصور عبد القاہر بن طاہر البغدادی) ...... تھے"[3]

سارٹن دوسری جگہ علم الحساب میں ان کے تبحر و دستگاہ عالی کے بارے میں لکھتا ہے:

"ابو منصور (؟ عبد القاہر) ابن طاہر بن محمد البغدادی نیشاپور میں رہتا تھا، اسفرائن (اصفہان) میں ۱۰۳۷ء یا ۴۲۹ھ میں فوت ہوا، مسلم ریاضی دان تھا، مسلم فلسفہ اور تاریخ کا بھی عالم تھا، شافعی فرقہ سے تھا، اس کا شاہکار کتاب الفرق بین الفرق (یا بین الفرق) ہے، اس نے علم حساب میں بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم التکملہ (التکملہ) ہے، پیچیدہ مسائل وراثت کے (از روئے احکام شرع) حل کرنے میں بڑا مشتاق تھا۔"[4]

شعر و شاعری کا مشغلہ امام عبد القاہر فقہ، کلام اور حساب کے علاوہ علوم ادبیہ میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے تھے، مگر اس شغل میں بھی ایک عالم دین کی شان برقرار رہتی تھی، مثلاً آیۂ کریمہ

[1] فوات الوفیات ج ا ص ۲۹۸ [2] طبقات الفقہاء الشیرازی ص ۱۱۱ [3] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ اول ص ۱۴۳ [4] ایضاً ص ۱۷۹-۱۸۰

ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف کی تضمین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یا من عدا ثم اعتدی ثم اقترف　　ثم انتھی ثم ارعوی ثم اعترف

ابشر بقول اللہ فی آیاتہ　　ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف[1]

ایک اور قطعہ میں ایک فقہی مسئلہ کی تلمیح ہے، جو احناف و شوافع کے درمیان اہم اختلافی مسئلہ ہے، احناف کہتے ہیں کہ نابالغ کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، مگر شوافع کے یہاں واجب ہے،

طلبت من الحبیب زکاۃ حسن　　علی صغر من القدر البھی

فقال وھل علی مثلی زکاۃ　　علی قول العراقی الکمی

فقلت الشافعی لنا امام　　وقد فرض الزکاۃ علی الصبی

ان کے یہ دو شعر اہل علم کی معاشی دقتوں کے ترجمان ہیں:

یا سائلی عن قصتی　　دعنی امت فی غصتی

المال فی ایدی الوری　　والیأس منہ حصتی[3]

اسی مضمون کو محقق دوانی نے اخلاق جلالی میں بیان کیا ہے

مرا بتجربہ معلوم گشت آخر حال　　کہ قدر مرد بعلم است و قدر علم بمال

تصانیف | امام عبدالقاہر بغدادی کثیر التصنیف فاضل تھے۔ سبکی نے ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں گنائی ہیں:

۱- کتاب التفسیر (۲) کتاب تاویل متشابہ الاخبار (۳) کتاب نقض اعلہ ابوعبداللہ الجرجانی فی ترجیح مذہب ابی حنیفہ (۴) کتاب احکام الوطء التام (۵) کتاب شرح مفتاح ابن القاص (۶) کتاب العماد فی مواریث العباد (۷) کتاب التکملہ فی الحساب (۸) کتاب الفصل فی اصول الفقہ

---

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۹ [2] ایضاً ص ۲۴۰ [3] ایضاً ص ۲۴۱ [4] ایضاً ص ۲۳۹

(۹) کتاب الصفات (۱۰) کتاب نفی خلق القرآن (۱۱) کتاب ابطال القول بالتولد (۱۲) کتاب الایمان واصولہ (۱۳) کتاب فضائح المعتزلہ (۱۴) کتاب فضائح الکرامیہ (۱۵) کتاب الفرق بین الفرق (۱۶) کتاب الملل والنحل (۱۷) کتاب بلوغ المدی عن اصول الہدی (۱۸) کتاب تفضیل الفقیر الصابر علی الغنی الشاکر

(۱۹) ان کتابوں کے علاوہ حافظ ابن الصلاح نے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں امام عبدالقاہر نے لفظ تصوف اور صوفی کی تحقیق کی تھی، اور اس موضوع پر صوفیاے کرام کے ایک ہزار اقوال جمع کیے تھے۔[1]

ابوبکر الحسینی نے تین اور کتابوں کے نام لیے ہیں، جو شافعی فقہ کی ادبیات عالیہ میں محسوب کی جاتی تھیں:[2]

(۲۰) کتاب مفرد فی الفرائض: غالباً یہ کتاب العماد فی مواریث العباد ہو، جس کی سبکی نے تعریف کی ہے[3]

(۲۱) کتاب فی القضایا والوصایا (۲۲) کتاب القدریات

ان کے علاوہ ایک اور کتاب ان کی طرف منسوب ہے جس کا تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا یعنی

(۲۳) اصول الدین: یہ کتاب خوش قسمتی سے شائع ہو گئی ہے۔

اصول الدین میں امام عبدالقاہر نے اپنی کچھ کتابوں کے نام لیے ہیں، جن میں سے بعض تو وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں مثلاً "کتاب الایمان" جس کا دو مرتبہ حوالہ دیا ہے:

(الف) اصل ثانی (فی اصول الایمان) کے مسئلہ اول (فی بیان حقیقۃ الایمان والکفر) کے آخر میں

وقد استقصیناھذہ المسئلۃ　　ہم نے اس مسئلہ پر پوری بحث کتاب الایمان

فی کتاب المفرد فی الایمان[4]　　میں کی ہے۔

(ب) اسی اصل کے آخری اور پندرھویں مسئلہ (فی بیان الفرق بین دارالاسلام و دارالکفر) کے خاتمہ پر

"وقد استقصیناھذہ المسئلۃ فی کتاب الایمان"[5]

---

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۹ [2] طبقات الشافعیہ لابی بکر ہدایت اللہ الحسینی ص ۵۵ [3] طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۹ (لیس فی الفرائض والحساب نظیر) [4] اصول الدین [5] ایضاً

امام عبد القاہر کی جو کتابیں اوپر مذکور ہوئیں، ان کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ "اصول فقہ" کے موضوع پر ان کی ایک ہی کتاب تھی، یعنی "کتاب الفصل" جس کے متعلق تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ یہ اصول فقہ میں تھی، لیکن خود امام عبد القاہر نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ چنانچہ

(الف) اصل اول (فی بیان الحقائق والعلوم) کے دسویں مسئلہ (فی بیان مآخذ العلوم الشرعیہ) میں "اصول اربعہ" (کتاب، سنت، اجماع، قیاس) کے اندر ان فرقوں کے نام لیے ہیں جنھیں انکی مشروعیت و معقولیت سے اختلاف ہے، ضمناً کہیں کہیں مخالفین کا رد بھی کیا ہے، مگر آخر میں لکھا ہے

"وقد استقصینا الرد علی ھؤلاء المخالفین فی ھذہ الوجوہ فی کتبنا الموضوعۃ فی اصول الفقہ"۔[1]

(ب) اصل تاسع (فی بیان معرفۃ ارکان الاسلام) کے چودھویں مسئلہ (فی بیان مآخذ احکام الشریعۃ) کے آخر میں لکھا ہے کہ ادلۂ شرعیہ کے باب میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں جنھیں ہم نے اپنی اصول فقہ کی کتابوں میں تفصیلی طور پر بیان کیا ہے:-

"وفی الادلۃ الشرعیۃ انواع من الخلاف قد استقصیناھا فی کتبنا فی اصول الفقہ"۔[2]

مگر ان اصول فقہ کی کتابوں کے نام نہیں بتائے۔ ان کے علاوہ دو اور کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو اپنے موضوع پر مستقل تصانیف تھیں:-

(۲۴) ایک "الرحمن علی العرش استوی" کی تاویل میں کہ اس آیت میں عرش سے مراد "ملک" ہے، چنانچہ اصل ثالث (فی معرفۃ صانع العالم ومعرفۃ نعوتہ الذاتیہ) کے ساتویں مسئلہ (فی احالۃ کون الالہ فی مکان دون مکان) کے آخر میں لکھتے ہیں:

[1] اصول الدین [2] اصول الدین

"والمراد بالعرش الملک۔ وقد استقصینا ھذہ المسئلۃ فی کتاب مفرد"۔[1]

(۲۵) دوسری فروع معاملات اور ان کی شروط میں چنانچہ اصل تاسع (فی معرفۃ ارکان الاسلام) کے نویں مسئلہ (فی بیان احکام المعاملات) کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"وللکلام فی فروع المعاملات وشروطھا کتاب مفرد"۔[2]

ان کے علاوہ "اصول الدین" میں تین کتابوں کے نام لیے ہیں:

(۲۶) کتاب ھیئۃ العالم۔ غالباً اس کتاب میں انھوں نے ماہرین ہیئت اور اہل طبعیات کے ان اقوال پر تنقید کی ہے جو انھوں نے آسمانوں کی حقیقت، ترکیب، تعداد اور حرکات کے بارے میں پیش کیے تھے، چنانچہ اصل ثانی کے تیرہویں مسئلہ (فی وقوف السموات واعدادھا) میں لکھتے ہیں:

"وقد استقصینا ھذہ المسئلۃ واشکالھا فی کتابنا الذی سمیناہ کتاب ھیئۃ العالم"۔[3]

(۲۷) کتاب دلائل النبوۃ۔ اس کتاب میں ان مختلف فرقوں کے اختلافات اور تنقید کا بیان ہے جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہیں، یا ختم رسالت کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ اصل سابع (فی معرفۃ الانبیاء علیہم السلام) کے چوتھے مسئلہ (فی بیان عدد الانبیاء والرسل علیہم السلام) میں تیرہ فرقوں کے اختلافات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والکلمۃ فی ھذا الباب قد استقصیناھا فی کتاب دلائل النبوۃ[4]

(۲۸) کتاب الموازنۃ بین الانبیاء: اس کتاب میں تمام انبیاء سابقین کے معجزات تحریر کرنے کے بعد ثابت کیا تھا کہ یہ سارے معجزات ہمارے پیغمبر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھے، چنانچہ اصل ثامن (فی المعجزات والکرامات) کے دسویں مسئلہ (فی بیان معجزۃ کل نبی علی التفصیل) کے آخر میں لکھتے ہیں:

[1] اصول الدین [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

"واجتمعت فی نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جمیع وجوہ المعجزات التی تفرقت فی الانبیاء کما بیناھا فی کتاب الموازنة بین الانبیاء"[1]

ایک اور کتاب کا حوالہ "الفرق بین الفرق" میں دیا ہے، وہ یہ ہے:

(۲۹) الحرب علی ابن حرب: جو انھوں نے جعفر بن حرب معتزلی کے رد میں لکھی تھی، چنانچہ الفرق بین الفرق کے باب سوم کی تیسری فصل "فی فرق المعتزلہ" میں فرقہ "جعفریہ" کے آخر میں لکھتے ہیں کہ جعفر بن حرب نے اپنے اقوال ایک کتاب میں جمع کیے تھے، جن کا ہم نے ایک مستقل کتاب میں رد کیا ہے، اور اس کا نام "الحرب علی ابن حرب" رکھا ہے۔[2]

مذکورۃ الصدر کتابوں کے علاوہ دنیا کی لائبریریوں میں دو اور کتابیں ملتی ہیں جو امام عبد القاہر کی طرف منسوب ہیں:۔

(۳۰) کتاب تفسیر اسماء الحسنیٰ، اور (۳۱) کتاب فی المساحۃ۔

تصانیف جو موجود ہیں ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی تصانیف ہوں، مگر خود مذکورہ بالا کتابوں میں سے بھی بیشتر کتابیں آج ناپید ہیں، صرف مندرجۂ ذیل کتابیں موجود ہیں:

۱۔ الملل والنحل۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ عاشر آفندی میں ہے (نمبر ۵۵۵)۔ دوسرا ڈاکٹر زاہد الکوثری نے مکتبۂ اوقاف بغداد میں پایا ہے،

۲۔ کتاب تفسیر اسماء الحسنیٰ۔ برٹش میوزیم (نمبر 7547 Or)

۳۔ نضائح القدریہ۔ اس کا خلاصہ خود مصنف نے "الفرق بین الفرق" کے باب سوم کی تیسری فصل میں دیا ہے۔

۴۔ تاویل المتشابہات فی الاخبار والآیات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سبحان اللہ خاں کلکشن (نمبر ۹۵)

---

[1] اصول الدین [2] الفرق بین الفرق ص ۱۰۲

۵۔ التکملہ فی الحساب: اگرچہ اس کتاب کے بارے میں مرحوم آقا قزوینی نے لکھا تھا:

"ابو منصور بغدادی یعنی ابو منصور عبد القاہر بن طاہر بن محمد البغدادی الفقیہ الاصولی الشافعی المتوفی ۴۲۹ھ کتاب تکملہ رسالہ ایست از مولفات او در علم حساب و در کتابخانہ ہائے اروپا گویا نسخہ از آں موجود نیست۔" (چہار مقالہ گب میموریل ایڈیشن ص ۱۹۷)

مگر اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے (نمبر 6013 Or) اور دوسرا ترکی کے کتبخانہ لالہ لی میں (نمبر ۲۷۰۸)

۶۔ کتاب فی المساحۃ: علی گڑھ (نمبر ۱۴)

۷۔ اصول الدین: اس کا نسخہ پروفیسر ریٹر کو قسطنطنیہ میں دستیاب ہوا تھا، جسے اس نے ۱۹۲۸ء میں استانبول سے شائع کر دیا،

۸۔ الفرق بین الفرق: اس کا ایک نسخہ امپیریل لائبریری برلن میں ہے، جسے ۱۹۱۰ء میں محمد آفندی بدر نے قاہرہ سے شائع کر دیا، دوسرا نسخہ چلپی زادہ کے کتب خانہ میں ملا، اسے برلن کے نسخہ اور الفرق بین الفرق کے اختصار (مخطوطہ کتبخانہ ظاہریہ دمشق) کی مدد سے مرحوم شیخ زاہد کوثری نے ۱۹۴۸ء میں قاہرہ سے شائع کیا، اسی ایڈیشن کا فارسی ترجمہ محمد جواد بہاء الدین مشکور استاد دانشگاہ تبریز نے ۱۳۳۳ شمسی میں تبریز (چاپخانہ شفق) سے شائع کیا ہے،[1]

مختصر الفرق بین الفرق کو جو اغلاط سے پر ہونے کے علاوہ ناقص بھی ہے، فلپ حتی نے ۱۹۲۴ء میں قاہرہ سے شائع کیا ہے،

---

[1] انگریزی زبان میں بھی "الفرق بین الفرق" کے مختلف اجزاء کے ترجمے ہوئے تھے: پہلا ترجمہ مسز سیلی (Kate Chambers Seely) نے محمد آفندی بدر کے ایڈیشن کا از اول تا ص ۱۰۹ Muslim Schisms and Sects" کے عنوان سے ۱۹۲۰ء میں نیویارک سے شائع کیا، یہ ترجمہ Columbia University Oriental Studies کی پندرہویں جلد میں چھپا ہے۔ دوسرا ترجمہ ہالکنس (A.S. Halkin) نے ۱۹۳۵ء میں تل ابیب (Tel Aviv) اسرائیل سے شائع کیا ہے، اس کا عنوان ہے Muslim Schisms and Sects, being the history of the various philosophical systems developed in Islam

انداز نگارش امام ابو منصور بغدادی کے انداز تصنیف کے بارے میں حافظ ابن عساکر نے امام ابو عثمان الصابونی سے نقل کیا ہے:-

"بدیع الترتیب، غریب التالیف والتہذیب"۔[۱]

امام سبکی نے ان کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے:-

وجمیع تصانیفہ بالغۃ فی الحسن اقصی الغایات[۲]	ان کی جملہ تصانیف جودت و خوبی میں انتہائی حد کو پہنچی ہوئی ہیں،

چنانچہ "کتاب الملل والنحل" کے بارے میں انھوں نے تبصرہ کیا ہے:

لیس فی ھذا النوع مثلہ[۳]	اس موضوع پر اس جیسی اور کوئی کتاب نہیں ہے

اسی طرح انھوں نے کتاب التعامل فی مواریث العباد" کے بارے میں لکھا ہے:-

لیس فی الفرائض والحساب لہ نظیر[۴]	علم الفرائض اور علم الحساب میں یہ کتاب بے نظیر ہے

اسی طرح "التکملۃ" کے بارے میں امام رازی نے لکھا تھا کہ امام ابو منصور بغدادی کی عظمت و جلالت قدر کے لیے اکیلی یہی کتاب کافی ہے۔

"ولو لم یکن لہ الا کتاب التکملۃ فی الحساب لکفاہ"۔[۵]

نظامی عروضی سمرقندی بھی حساب کے طالب علموں کو احمد بن عبد الجلیل السجزی کی کتاب "صد باب سجزی" کے دوش بدوش "التکملۃ" کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہے:

"الحساب صناعتی است کہ اندر وشناختہ شود، حال انواع عدد و خاصہ ہر نوعے از در نفس خویش مشتمل است .... و مشتمل است اصول اوراکتاب ارثماطیقی و فروع او را التکملہ ابو منصور بغدادی یا صد باب سجزی"۔ (چہار مقالہ گب میموریل ایڈیشن ص ۵۴)

۱؎ تبیین کذب المفتری ص ۲۵۳ ۲؎ طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۹ - ۲۴۰ ۳؎ ایضاً ص ۲۳۹ و ۴؎ ایضاً ص ۲۳۹ ۵؎ الریاض المونقہ للامام الرازی بحوالہ طبقات الشافعیہ للسبکی جلد ثالث ص ۲۳۸

نفحات الانس پر تحقیقی نظر

از جناب سید وحید اشرف صاحب شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان، ایران اور دوسرے ممالک اسلامیہ کی علمی و ادبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ صوفیہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، شعر و ادب، سیاست و معاشرت، تمدن و معیشت، علم و ثقافت اور فکر و عمل کے رجحانات صوفیہ کے تصور حیات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں علم و فکر کا وہ سرمایہ جو صوفیہ کا مرہون منت ہے اور جس نے صدیوں یہاں کی تاریخ و تہذیب کو متاثر کیا، ابتک بے اعتنائی کا شکار رہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ صوفیہ کی مقدس زندگی ان کے ساتھ عوام الناس کی والہانہ عقیدت کی وجہ سے مبالغہ آمیز روایات و تصورات سے محفوظ نہ رہ سکی، اور اس کو تاریخی واقعیت کے ساتھ ہم آہنگ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا، اور نقاد کے حدود ہی میں اس کو محدود رکھا گیا، لیکن اگر صوفیہ کے تذکرے ان کی عقل و قیاس سے ماوراء روحانیت کی بنا پر مبالغہ آمیز روایتوں سے محفوظ نہ رہ سکے تو تاریخ ہی کی کونسی ایسی کتاب ہے جو رطب و یابس سے بالکل پاک ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیہ کے کارناموں سے بے خبر ہو کر تاریخ اسلام کا مطالعہ ہمیشہ ناقص رہے گا، بقول پروفیسر نظامی

"اسلامی تاریخ میں صوفیہ کے کارنامے یقیناً خاص توجہ کے مستحق ہیں، مسلمانوں کی ملی زندگی میں جب کوئی مشکل مقام آیا ہے تو ان ہی بزرگوں نے بصیرت اور حکمت کے ساتھ نامساعد

حالات کا مقابلہ کیا ہے، ان کا ہاتھ ملت کی نبض پر اور ان کا دماغ تجدید و احیاء کی تدبیریں سوچنے میں مصروف رہتا تھا، اسلامی سوسائٹی کا مزاج قائم رکھنے کے لیے انھوں نے بڑی پرخلوص جد و جہد کی تھی۔"[1]

صوفیہ کے تذکرے ایک طرف جہاں ان کی زندگی کو سمجھنے میں معاون ہیں، وہاں خود تاریخ ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں، اور ادبی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کے حامل ہیں، لیکن ابتک جو اہمیت اور مقبولیت نفحات الانس کو حاصل رہی ہے، وہ کسی دوسرے تذکرے کو نصیب نہ ہوسکی، اس کی وجہ غالباً نفحات الانس کی زبان کی سلاست اور جامعیت اور خود جامی کی ممتاز شخصیت ہے، لیکن جو اہمیت ابتک اس تذکرے کو حاصل رہی ہے حقیقتہً وہ اس کی مستحق نہیں ہے، اس مقالہ میں فارسی ادب میں نفحات الانس کے صحیح مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صوفیہ کے تذکرے ابتداءً عربی زبان میں لکھے گئے، فارسی زبان میں غالباً پہلا تذکرہ، جو طبقات الصوفیہ کے نام سے موسوم ہے، پانچویں صدی ہجری میں لکھا گیا، یہ تذکرہ دراصل شیخ ابو اسمٰعیل عبد اللہ انصاری ہروی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے ان کے کسی شاگرد و مرید نے جمع کیا تھا، یہی طبقات الصوفیہ ہروی نفحات الانس کا اصل ماخذ ہے۔

طبقات الصوفیہ ہروی، زبان کے لحاظ سے فارسی ادب کے طالبعلم کے لیے بہت دلچسپ ہے، جامی کے قول کے مطابق یہ قدیم ہروی لہجہ میں تھا، جو کاتبوں کی تحریف کی وجہ سے ان کے زمانے (نویں صدی ہجری) تک اور بھی زیادہ مشکل ہوگیا تھا، مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں:

"...... والحق آں کتابیست لطیف و مجموعہ ایست شریف مشتمل بر حقایق معارف صوفیہ و دقایق لطائف ایں طائفہ، اما چوں بزبان ہروی قدیم کہ در آں عہد معہود بودہ وقوع یافتہ

بتصحیف و تحریف نویسندگان بجائی رسیدہ کہ در بسیاری از مواضع فہم مقصود بسہولت دست نمید ہد و ایضاً مقتصر است بر ذکر بعضی متقدمان و از ذکر بعضی دیگر و از ذکر حضرت شیخ الاسلام و معاصران و متاخران از وی خالیست، بارہا در خاطر ایں فقیر میگذشت کہ بقدر وسع و طاقت در تحریر و تقریر آں کوشش نماید و آنچہ معلوم میشود بعبارتی کہ متعارف اہل روزگار است در بیان آرد و آنرا کہ مفہوم نشود در حجاب ستر و کتمان گذارد و از کتب معتبرہ دیگر سخنان چیدہ و معارف سنجیدہ، اضافۂ آن کردہ بر لوح تبیان نگارد و شرح احوال و مقامات و معارف و کرامات و تاریخ ولادت و وفات جماعتی کہ در آں کتاب مذکور نشدہ بآں منظم گرداند......"[1]

جامی کے اس بیان سے مندرجۂ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

(۱) طبقات الصوفیہ کا لہجہ قدیم ہروی تھا، جو جامی کے عہد میں رائج نہ تھا، اور اس میں تحریف کی وجہ سے بہت سے مقامات اشکال سے خالی نہ تھے، جامی نے اس میں ضروری ترمیم کرکے اسے عام فہم بنا دیا، اس لیے ہروی کو سمجھنے کے لیے جامی کا پڑھنا ناگزیر ہے، اس لیے نہ صرف تذکرہ بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی نفحات الانس خصوصی اہمیت کا حامل ہے،

(۲) جامی نے نفحات الانس میں بعض متقدمین صوفیہ کے احوال بیان کیے ہیں، جن کا ذکر ہروی میں نہیں ہے، اس لیے تذکرۂ صوفیہ کے لحاظ سے بھی نفحات الانس خاص اہمیت رکھتی ہے،

(۳) جامی کے اس قول سے کہ "و آنرا کہ مفہوم نشود در حجاب ستر و کتمان گذارد"۔ ظاہر ہوتا ہے کہ طبقات الصوفیہ ہروی کے کچھ حصے جامی کے لیے بھی بعید از فہم تھے، اور وہ "در حجاب ستر و کتمان" ہی رہے۔

(۴) جامی نے نفحات الانس میں کچھ "سخنان چیدہ و معارف سنجیدہ" کا بھی اضافہ کیا ہے، جو

ہروی میں نہیں ہے، اور اس اضافہ سے اس کتاب کی افادیت و اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نفحات الانس میں جو خصوصیات جامی نے دعوی کے ساتھ بتائی ہیں، وہی خصوصیات جامی کے ایک پیشرو، آٹھویں اور اوائل نویں صدی ہجری کے ایک ایرانی صوفی اور شاعر کے ملفوظات میں بغیر کسی دعوے کے پائی جاتی ہیں، یہ بزرگ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ ہیں جن کا مزار صوبۂ یوپی ضلع فیض آباد میں ایک قریہ کچھوچھہ شریف میں آج بھی مرجع خلائق ہے، اور ان کے ملفوظات کا مجموعہ لطائف اشرفی کے نام سے موسوم ہے۔

حضرت سید اشرف کا آبائی وطن سمنان تھا، سات سال کی عمر میں قرأت سبعہ کے ساتھ قرآن حفظ کر لیا، چودہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم کی تکمیل کر لی، ابتداءً شیخ علاء الدولہ سمنانی (متوفی ۷۳۶ھ) سے سلوک کی تعلیم حاصل کی اور بیس یا ستائیس سال کی عمر میں ترکِ وطن کر کے بنگال میں شیخ علاء الحق پنڈوی کی خدمت میں حاضر ہو کر راہِ سلوک طے کی اور ارادت وخلافت کے حصول کے بعد مشرقی یوپی کو اپنی تبلیغ کا مرکز اور کچھوچھہ کو اپنا مسکن قرار دیا، آپ ایک متبحر عالم، خدا رسیدہ بزرگ، باذوق شاعر اور ادیب اور موثر شخصیت کے مالک تھے، صوفیہ کے تذکروں میں آپ کا ذکر جہانگیر، قطب عالم، غوث العالم اور محبوب یزدانی کے القاب سے کیا جاتا ہے[1]،

لطائف اشرفی کو آپ کے ایک مرید و خلیفہ نظام الدین غریب یمنی نے مدون کیا، جو تیس سال تک مسلسل (۷۷۸ھ سے ۸۰۸ھ تک) سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہے تھے، اور اس کے بعد بھی آپ کی صحبت سے فیض اٹھاتے رہے، لطائف اشرفی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ...... ارشادات کو قلمبند کرنے کے بعد جامعِ لطائف اسے حضرت سید اشرف کی خدمت میں پیش کر دیتے اور آپ اسکو دیکھ کر ملفوظات کی تصدیق فرماتے یعنی اس کے مضامین کے علاوہ الفاظ بھی تقریباً آپ ہی کے ہیں یا آپکے تصدیق کردہ ہیں (باستثناء چند ابواب کے یا بعض ابواب کے کچھ حصوں کے) چنانچہ نظامی یمنی

[1] برکات چشتیہ ص ۱۲

دیباچۂ لطائف میں لکھتے ہیں:

"..... آنچہ قابل ضبط ذہن و حامل فکر ایں ممتحن بود در قید کتابت آورده بنور اطلاع انظار حضرت ایشاں رسانیده بحضور استماع احضار مخصوصی گذرانیده و از اول تا آخر ورقاً بعد ورقٍ گردانیده بلکہ اکثر عین الفاظ شریفہ و اقوال صریحۂ ایشان با مضمون مقول بنوک قلم رسانیده ....."[1]

لطائف اشرفی اور نفحات الانس کے تحقیقی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر کو نفحات الانس کے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، اور نفحات الانس کا بیشتر حصہ بغیر کسی تبدیلی کے لطائف اشرفی ہی کے مواد پر مشتمل ہے۔

جن شواہد اور دلائل کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے، ان پر بحث کرنے سے پہلے ایک شبہہ کا ازالہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے،

ممکن ہے کسی کو شبہہ ہو کہ لطائف اشرفی نویں صدی کے بعد کی تصنیف ہو، اور غلط طور سے حضرت سید اشرف کی ذات سے منسوب کر دی گئی ہو اور خود اس کے مصنف نے نفحات الانس ہی سے خوشہ چینی کی ہو، کیونکہ اس کا کوئی نسخہ نویں صدی یا اس سے قبل کا موجود نہیں ہے،

اگرچہ لطائف اشرفی کا نویں صدی یا اس سے قبل کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے، لیکن ایسے دلائل و قرائن موجود ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ لطائف اشرفی آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف اور سید اشرف سمنانی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے،

حضرت سید اشرف کے خطوط کا مجموعہ جو مکتوبات اشرفی کے نام سے موسوم ہے اور جس کے متعدد نسخے متعدد لائبریریوں میں موجود ہیں، اس میں لطائف اشرفی کے جگہ جگہ حوالے ملتے ہیں، یہ وہ خطوط ہیں جو ۸۰۰ھ کے بعد لکھے گئے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لطائف اشرفی ۸۰۰ھ سے پہلے

[1] لطائف اشرفی ص ۵

مدون و مرتب ہو چکی تھی، البتہ کچھ اضافے آپ کی وفات کے بعد بھی ہوتے رہے،

ذیل میں مکتوبات میں لطائف اشرفی کے حوالوں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

(۱) مکتوب نمبر ۹

"...... شیخ بایہ کردیں خواص مخصوص بود و بایں اختصاص منصوص و با وصاف دیگر نیز بایہ گرموصوف بود و باعتراف آخر معروف چنانکہ در لطائف برادر اخص الاحباب شیخ نظام یمنی مذکور کردہ تا در خور اقتدائی و از در رہنمائی بود۔"

(۲) مکتوب نمبر ۱۹

"...... بعینہ آں مسودۂ ایں درویش در ملفوظات و مقامات لطائف درج کردہ، ارخی از عمر گرانمایہ بلکہ فرخی از ایام سرمایہ در ترتیب و ترکیب جمع آں واردات غیبی و الہامات لاریبی خرج ...... ازیں وادیہ ہرکرا داعیۂ تحقیق سخنی بودہ باشد فلیطلب ثمہ۔"

(۳) مکتوب نمبر ۳۲

"...... باقی سادات عراق و خراسان و ماوراء النہر و جمیع امصار و دیار آں صدور در لطائف اشرفی فرزند اعز الاحباب و الاحباب نظام حاجی غریب یمنی ...... یکدیگر جمع کردہ اند۔"

(۴) مکتوب نمبر ۴۰

"ہدایت الاولیاء فی الشریعت نہایت الانبیاء فی الطریقت یعنی ...... چنانکہ در لطائف فرزند اعز نظام الدین یمنی ذکر کردہ است۔"

(۵) مکتوب نمبر ۴۹

"...... منشای ہر مجالس برادر اعز شیخ نظام الدین در لطایف ذکر کردہ اند۔"

(۶) مکتوب نمبر ۵۲

"...... وآنچہ وظائف از برای قمع اعدای دیار و جہت قلع اشرار روزگار درخواست کردہ اند از کتاب لطائف معلوم خواہد شد۔"

(۷) مکتوب نمبر ۵۴

"ہدایت مقراض راندن ...... چنانکہ در لطائف برادر اعز الاصحاب شیخ نظام الدین یمنی درج کردہ اند۔ اگر احتیاج بود از وطلب دارند۔"

(۸) مکتوب نمبر ۶۲

"...... اگر اصحاب شریعت و ارباب ذریعت روایت فقہ خواہند بجا یابند چہ در لطائف فرزند اعز نظام الدین درین وادیہ نیک رفتہ اند۔"

مکتوبات کے علاوہ آپ کی دوسری تصانیف سے لطائف کا مقابلہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آپ ہی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے،

مثلاً ارشاد الاخوان[۱] جس میں لطائف اشرفی ہی کے مباحث کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس میں اور لطائف کی زبان میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے، اس سے ذیل میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں،

ارشاد الاخوان	لطائف اشرفی
(۱) "میان اصناف خلائق این سخن متداول	(۱) میان اصناف خلق و اطراف افق ایں

۱؎ ارشاد الاخوان حضرت سید اشرف کی تصنیف ہے، یہ کتاب آپ نے اپنے مرید و خلیفہ سیف خاں بن حسام نوا کے لیے لکھی تھی، اصل میں لطائف اشرفی کی نقل نہیں ہے، البتہ مخاطب کے پیش نظر اس میں غنا کی فضیلت پر زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس کتاب کا تذکرہ لطائف اشرفی میں بھی ملتا ہے، (دیکھئے لطائف اشرفی جلد ۲ ص ۱۱۵) اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

است کہ فقیر را با سلاطین و ملوک چہ نسبت
این اصطلاح عوام است و غلطی است
عظیم، بوی جہل و پندار و خودبینی ازین
سخن می آید. ای عزیز اگر خود را بہتر از
دیگری میدانی آن خود فعل ابلیس است
و آن صفت امارہ است. قال اللہ تعالیٰ
انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ
من طین، و اگر او را بہتر و کاملتر تصور
کردہ ای از مقام ادنی باعلیٰ ترقی کردہ باشی
در ولا تزر وازرة وزر اخری
خواندی ولیکن چہ فائدہ چوں ندانستی
حسنات ابرار در دیوان اشرار ننویسند
و سیأت اشرار در جرائد اعمال ایشان
ثبت نگردانند...... آمدیم در اصل
بحث کہ سلاطین و ملوک یا عادل اند
و عابد یا فاسق اند و ظالم، روی عا
و عادل دیدن مبارک است حیث
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند
ملاقات الملوک تنزل الرحمۃ. باوجود

سخن متداول است کہ فقیر را با سلاطین
و ملوک چہ نسبت و درویش را بخواقین
سلوک کردن چہ حاجت؟ بباید دانست
کہ این اصطلاح عوام غلطی است عظیم
کہ بوی جہل و پندار و نخوت سہل و استکبار
ازین سخن می آید، ای عزیز اگر خود را بہتر
از دیگری میدانی آن خود عمل ابلیس
و فعل ابلیس است و صفت نفس امارہ
قال اللہ تعالیٰ انا خیر منہ خلقتنی
من نار و خلقتنی من طین و اگر او را
بہتر و کامل تصور کردہ از ادنی باعلیٰ ترقی
کردہ باشی. در کریمہ ولا تزر وازرة
وزر اخری خواندہ ولیکن چہ فائدہ چوں
صورت معانی وی ندانستی! حسنات
ابرار در دیوان اشرار و سیأت اشرار
در جرائد احرار ثبت نکنند...... آمدیم
در اصل بحث کہ سلاطین و ملوک عادل
و عابد اند یا ظالم، اگر عادل اند وی عادل
و عابد دیدن مبارک است حیث قال

شرک نوشیروان حضرت رسالت صلی اللہ
علیہ وسلم مفاخرت و مباہات میفرماید
ولدت فی زمن الملک العادل نوشیروان
قال علیہ السلام ان افضل عباد اللہ
عند اللہ منزلۃ یوم القیامۃ امام عادل
رفیق کامل و کدام مرتبہ عالی تر از آنکہ
اراذل و اشرار از خوف ایشان سر در
ربقۂ اطاعت و انقیاد آورند و پای
خود را از حدود اعتدال بیرون نمی نہند
و ابرار و اخیار با حصول غرض معاش
ضروری و بعبادت خالق بفراغ خاطر
مشغول اند امیر المومنین علیؓ میفرماید
سلطان عادل خیر من مطر وابل، حیث
قال علیہ السلام عدل ساعۃ خیر من عبادۃ
ستین سنۃ" و اگر فاسق و ظالم است
دیدن او فرض است بر جمیع عباد و مشائخ
و مقتدا کہ بایں طائفہ ملاقات کنند توجہ
بامر شرع کنند، درین رو نیت معتبر است
انما الاعمال بالنیات نبی علیہ السلام

علیہ السلام عند ملاقات الملوک تنزل
الرحمۃ، باوجود شرک نوشیروان حضرت
علیہ الصلوٰۃ والتحیات بمفاخرت و مباہات
کلی فرمودند ولدت فی زمن الملک
العادل نوشیروان ایضاً قال علیہ السلام
ان افضل عباد اللہ عند اللہ منزلۃ
یوم القیمۃ امام عادل و رفیق کامل
و کدام مراتبہ عالی تر از آن باشد
اراذل و اشرار از دہشت سلطنت
و ہیبت شوکت ایشان سر در ربقۂ
انقیاد و اطاعت آورند و پای خود را
از دائرۂ اعتدال بیرون نزنند......
علی رضی اللہ عنہ فرمودند سلطان عادل
خیر من مطر وابل. قال علیہ السلام
عدل ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ
و اگر فاسق و ظالم است دیدن
او بر جمیع عباد و مشائخ و زہاد
فرض است کہ البتہ تبلقین آورند
نہ از برای جذب جیفہ و اموال کثیفۂ دنیا....

در دریای الوہیت مستغرق و ولی تابع نبی	حیث قال علیہ السلام الاعمال بالنیات
التابع کالمتبوع	نبی علیہ السلام در دریای الوہیت
پوشیدہ مرقع اند این خامی چند	مستغرق و ولی تابع نبی التابع کالمتبوع...
بربستہ طامات الف لامی چند	پوشیدہ مرقع اند این خامی چند الخ
نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند	....
بدنام کنندۂ نکو نامی چند	
....	اما فقیر مکمل اگرچہ در عالم کثرت
اگرچہ فقیر کامل در عالم کثرت بصورت بشر نماید	بصورت بشر نماید فاما او ماہی
فاما او ماہی بحر وحدت است ؎	بحر وحدت است ؎
بدانکہ پیر سراسر صفات حق باشد	بدانکہ پیر سراسر صفات حق باشد الخ[2]"
اگرچہ پیر نماید بصورت بشری	
بپیش تو چو کف است و بصفت چو دریا	
بپیش خلق مقیم است و بہر دمش سفری[1]	
وقتیکہ این فقیر بحضرت مخدوم عالم و پیشوای بنی آدم	(۲) وقتیکہ این فقیر بخدمت مخدوم عالم و پیشوای بنی آدم
شیخ علاء الحق والشرع والدین طیب اللہ مثواہ	شیخ علاء الحق والدین طیب اللہ ثراہ و جعل الجنۃ
و جعل الجنۃ مثواہ رسید و بنظر ظاہر و باطن اختصاص یافت	مثواہ رسید و بنظر ظاہر و باطن اختصاص یافتہ و انواع
انواع و اجناس جامہای خاص مرحمت فرمودند بعد ازان	و اجناس جامہای خاص عنایت فرمودند ہم در آن

[1] ارشاد الاخوان فصل ہشتم [2] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۹

روز بر فقیری ایثار شد بعضی معاندان	روز بر فقیری ایثار شد بعضی معاندان
کہ بودند بر سبیل عصبیت و حسد در غیبت	بر سبیل عصبیت و برخی معاندان ابطر لیق
زبان طعنہ کشادند کہ کسوت خاص بدیگری	انانیت و حسد در غیبت زبان طعن کشادند
ایثار کردن کجا آمدہ است و بسمع مبارک	کہ کسوت خاص شاہی دختر را اختصاص
مخدوم عالم قدس اللہ روحہ العزیز رسانیدند	ناقتناہی بر دیگری ایثار کردن از کجا آمدہ است ؎
بلفظ در ربار فرمودند آن فقیر خطی نکند	اگر یابد کسی از خلعت خاص
کہ بی معنی باشد، از وی سوال کنند	نباشد جایزش بر دیگر ایثار
ازین فقیر پرسیدند این شکستہ در جواب	کہ آن لطفی بود از جانب او
گفت کہ جامہ عین پیر است یا غیر پیر؟	نباید دادنش از دست یکبار
عین خود تصور نتوان کرد زیرا کہ جامہ بمثابۂ	و این سخن را بسمع مبارک حضرت مخدومی رسانیدند
عرض است ہر آئینہ غیر باشد، پیر را نظر	بلفظ در ربار و بعبارت گوہر نثار فرمودند کہ
بر غیر است، مرید تابع صفات پیر است	فقیر خطے نکند کہ بی معنی باشد ہم از وی سوال کنید
اگر این فقیر بعوارضات التفات نماید اکتساب	این شکستہ در جواب گفت کہ جامہ عین پیر است
صفات پیر نکردہ باشد، ہر کہ اکتساب صفات	یا غیر پیر؟ عین خود تصور نتوان کرد زیرا کہ جامہ
پیر نکند او را با پیر چہ نسبت؟ شنیدن ہمین	بمثابۂ عرض است ہر آئینہ غیر باشد و پیر را نظر
مخدوم مخدومان چون این حکایت بازبیع ایشان	بر غیر نیست و مرید تابع صفات پیر است، اگر
برسانیدند درین باب تحسین فرمودند و دعا	این فقیر بعوارضات میل نماید اکتساب
در حق این فقیر کردند کہ خوشبوی تو از شرق	صفات پیر نکردہ باشد، ہر کہ اکتساب پیر
تا غرب برسد[1]	نکردہ باشد او را با پیر چہ نسبت باشد؟[2]

[illegible]

[1] ارشاد الاخوان فصل دہم [2] لطائف اشرفی ص ۳۳۲

حضرت شیخ اشرفؒ کی دوسری تصنیف "تنبیہ الاخوان"[1] اور لطائف اشرفی کی عبارتوں میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو:

تنبیہ الاخوان	لطائف اشرفی
حیث قال علیہ السلام افضل الذکر ذکر الخفی	"حیث قال علیہ السلام افضل الذکر الخفی
تو حقیقت ایں حدیث ندانستی، ذکر خفی کسی را	تو معنی حقیقت ایں حدیث را ندانستہ، ذکر خفی
مسلّم باشد کہ زبان او از یاد غیر ماندہ باشد	کسی را مسلّم باشد کہ زبان او از یاد غیر حق
و دل او ذاکر شدہ، دریں روزگار اکثر خلائق	ماندہ باشد و دل او ذاکر شدہ، دریں
بمعصیت و مناہی گرفتار اند کہ ظہر الفساد	روزگار اکثر خلائق امصار بمعصیت و
فی البر والبحر از جہت اظہار دعوت جہر گفتن	مناہی گرفتار اند کہ ظہر الفساد فی البر والبحر
اولیٰ وافضل باشد، غزاۃ کہ در روزگار	از جہت اظہار دعوت جہر گفتن اولیٰ تر بود
ایجاد ہنگام دغا روی بمعاندت کفار می آرند	... حضرت قدوۃ الکبریٰ میفرمودند کہ
و تن خود را در راہ حق فدا میکنند تکبیر جہری	در زمین شروان کہ مسافران روزگار و
گویند تا خوف در دل کفار اثر کند در زمین	سایران دیار رسیدہ اند عجائب آں
شروان کہ مسافران روزگار در آں دیار	زمین و غرایب آں بریں مشاہدہ کردہ
رسیدہ و عجائب آں زمین را مشاہدہ کردہ	کہ پیوستہ مسلمانانِ آں دیار با کافران
معلوم دانند کہ پیوستہ مسلمانان آں دیار	پیکار و کارزار دارند و ایں از زمان
با کفار در محاربہ و مجادلہ اند و طایفہ ای	اسکندر و دارا وارد آمدہ است
از مسلمانان آنجا را غمروان گویند، روزی	و مسلمانان آنجا را شروان گویند، روزی

[1] یہ کتاب بھی حضرت سید اشرف نے سیف خاں کے لیے لکھی تھی، یہ چند اوراق کا ایک رسالہ ہے جس میں ذکر جہری کی فضیلت پر بحث کی گئی ہے، اس کا بھی ذکر لطائف اشرفی میں ہے۔ (دیکھئے لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۱۵)

تنبیہ الاخوان	لطائف اشرفی
اتفاقاً در آں لشکر اسلام مظفر و منصور	اتفاقاً در جنگ ایشان لشکر اسلام عسکر کرام
و کفار روی ہزیمت و فرار آوردہ اند	را ظفر و نصرت روی دادہ و سپاہ کافران
چند نفر از کفار بہزیمت اسیر و گرفتار	روی بہزیمت نہادہ..... چندی از کافران
شدند و مسلمانان از ایشان سوال کردند	شروان کہ ہزیمت خوردہ بودند اسیر و گرفتار
با وجود آلت و عدّت و کثرت ہجوم بی محابا	مسلمانان شدند، از ایشان کیفیت استفسار
و مقاتلہ ہزیمت نمود چگونہ بود؟ کافران	ہزیمت کردند کہ با وجود آلات کارزار و
در جواب گفتند ہر گاہ کہ آواز تکبیر بگوش	اسلحہ بیکار بی محاربہ و مقاتلہ چرا منہزم
ما رسید چناں خوف و دہشت مستولی	شدند؟ گفتند ہر گاہ کہ آواز تکبیر و صدای
می شد کہ جہاں تاریک مینمود ای برادر	تشما بگوش ما رسیدہ چناں ہیبت دلربای
اگر آواز ذاکران بگوش غافلان و	و دہشت جانگزای بر ما مستولی شد کہ
عاصیان روزگار رسد در ایشان	جہاں در چشم ما تاریک نمود.....
اثر کند تا از غرقاب غفلت بیروں	ای برادر اگر آواز ذکر آں بگوش غافلان
آیند و روی بعبادت خدای آرند چہ	کار و عاصیان روزگار برسد و در ایشان
عجب باشد! غالباً معنی ایں حدیث	اثر کند تا از غرقاب غفلت بروں آیند
رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر	چہ عجب باشد! غالباً ایں حدیث رجعنا
فہم نکردہ ہر گاہ کہ جمال اللہ در زاویۂ دل	من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر فہم
تابد و عشق رأیت ربی سبحانی در عرصۂ دل	نکردہ کہ مبارزان میدان عبادت و
برافروزد و بادشاہ با کفر در مجادلہ آید	دلبران جنگجوی انابت چوں در کارزار نفس

وخواہد کہ وجود از غیر خالی سازد و بی غوغا	می در آیند چناں نزد دلیرانہ و آوردہ
نتواند بود و بادشاہی بی کوکبہ و دبدبہ	رستمانہ میکنند کہ سبق نصرت و ظفر
چگونہ صورت بندد۔"	می ربایند۔" (لطائف اشرفی ص ۲۹۲)

یہ مثالیں یہ ثابت کرنے کیلئے بالکل کافی ہیں کہ لطائف اشرفی حضرت سید اشرفؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں جنکو طوالت کے خیال سے پیش نہیں کیا گیا، نفحات پر لطائف کے تقدم سے اس شبہہ کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے کہ آیا لطائف تک جامی کی رسائی ممکن بھی تھی؟ اس کے علاوہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری ہی میں لطائف کی مقبولیت اور شہرت اس امکان کو اور بھی زیادہ قرین قیاس بنا دیتی ہے، نفحات کی تاریخ تالیف ۸۸۳ھ ہے اور لطائف اشرفی ۷۸۳ھ کے پہلے مدون ہو چکی تھی، یعنی دونوں میں کوئی سو سال کا تفاوت ہے، مکتوبات اشرفی میں لطائف کے حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شریعت و طریقت کے مختلف مسائل میں حضرت سید اشرف نے اپنے مریدین کو لطائف اشرفی کی جانب رجوع کرنے کی تلقین کی تھی، یہ خطوط لکھنوتی (پنڈوہ)، گجرات، اجودھیا، جونپور، دہلی، بنگال وغیرہ ملک کے مختلف مقامات پر بھیجے گئے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ لطائف کے متعدد نسخے آٹھویں صدی ہجری میں مقبول ہو کر ملک کے مختلف حصوں میں پھیل چکے تھے، آج بھی اگرچہ لطائف اشرفی کا کوئی کلیۃً معتبر نسخہ موجود نہیں ہے، تاہم اس کے متعدد نسخے ملک کی مختلف لائبریریوں میں ہیں، لطائف اشرفی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کے مریدین میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے ہرات و سمرقند وغیرہ سے آکر آپ کی صحبت اختیار کی اور آپ سے خلافت و اجازت کے حصول کے بعد اپنے وطن واپس ہو گئے، مثلاً ابوالوفا خوارزمی[1] اور ابوالمکارم ہروی[2]

[1] شیخ ابوالوفا خوارزمی شیخ ابوالفتوح کے مرید تھے، اور حضرت سید اشرفؒ سے بھی خلافت حاصل کی اور ایک مدت تک سفر و حضر میں آپکے ساتھ رہے، آپ کا ذکر نفحات الانس میں بھی موجود ہے۔ [2] ابوالمکارم ہروی کا ذکر لطائف اشرفی میں ہے۔

ان لوگوں کے ذریعہ لطائف کا دوسرے ملکوں میں پہنچنا بالکل قرین قیاس ہے، اس لیے جامی کی بھی لطائف تک رسائی بعید از قیاس نہیں۔

اب ہم ذیل میں ان شواہد کو پیش کیا جاتا ہے، جن سے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ لطائف اشرفی کو نفحات الانس کے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے،

(۱) لطائف اور نفحات میں بعض ان صوفیہ کا ذکر یکساں الفاظ میں ملتا ہے جو حضرت سید اشرفؒ کے معاصرین و مصاحبین میں تھے، اس لیے ان صوفیہ کے تذکرہ کے اصل اور قدیم ترین ماخذ کی حیثیت لطائف اشرفی کو حاصل ہونی چاہیے، نہ کہ نفحات الانس کو۔ مثلاً

(الف) شیخ ابوالوفا خوارزمی (متوفی ۸۳۵ھ) جو مدت دراز تک حضرت سید اشرفؒ کی صحبت میں رہے، ان کے بارے میں نظام یمنی لکھتے ہیں:

"(فرزند) ابوالوفا خوارزمی را از مشارب صافیۂ ارباب توحید و اصحاب اذواق و مواجید مشرب تمام بودہ است۔"

ابوالوفا خوارزمی کے بارے میں یہی الفاظ نفحات الانس میں بھی ہیں۔

(ب) شیخ علاء الدولہ سمنانی (متوفی ۷۳۶ھ) کے بارے میں (جن سے سید اشرف نے ابتدا میں سلوک کی تعلیم حاصل کی تھی) نظام یمنی لکھتے ہیں:

"شیخ علاء الدولہ در اصل از ملوک سمنان است و از اقربای ایں فقیر میباشند و سبب توبۂ وی آں بود کہ بپانزدہ سالگی بملازمت سلطان وقت اشتغال مینمود، در یکے از حروب کہ حضرت ابراہیم را نور اللہ مضجعہ با اعدا بود وی را جذبہ ای رسیدہ و سوی بغداد مراجعت کرد و بصحبت حضرت شیخ نورالدین عبدالرحمٰن کسرقی سلوک میکرد و بعد از ترک تجرید و تفرید خرچ خانقاہ ایشان روزمرہ صد دینار بود و خانقاہ سکاکیہ از بناہائے

آبا، واجداد ایں فقیر در سمنان است بایشان تفویض یافت۔" (برکات چشتیہ ص ۲۵۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"شیخ علاء الدولہ سمنانی ابن احمد بن محمد البیابانکی در اصل از ملوک سمنان است، منصب وزارت حضرت ابراہیم شاہ بایشان مفوض بود، در یکے از حروب دیراجذبہ ای رسید بعدازاں در تسع وستین وستمایہ قیل در خمس وعشر وسبعمایہ والآخر اصح در صحبت شیخ نورالدین عبدالرحمٰن اسفراینی کرخی رسیدہ وشرف ارشاد یافتہ در خانقاہ سکاکیہ مدت شانزدہ سال صد وچہل اربعین برآورد، وگویند کہ در سایر اوقات صد وسی اربعین دیگر برآوردہ اند۔ چوں عمر وی ہشتاد وہشت سال رسید شب جمعہ بیست ودوم رجب ست وثلاثین وسبعمایہ در برج احرار صوفی آباد بجوار رحمت حق پیوست ودر خطیرۂ قطب الاوتاد عماد الدین عبدالوہاب مدفون شدہ۔" (لطائف اشرفی ص ۶۹ - ۳۶۸)

اگرچہ مندرجہ بالا بیانات تاریخی غلطیوں سے خالی نہیں ہیں (جس کی وجہ لطائف میں بعد کی تحریف ہی ہوسکتی ہے) تاہم نفحات ولطائف کی زبان کی یکسانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا، نفحات کے الفاظ یہ ہیں:

"وی در اصل از ملوک سمنان است، بعداز پانزدہ سالگی بخدمت سلطان وقت شغل گرفت در یکی از حروب کہ سلطان را با اعدا بودہ دیراجذبہ ای رسید، بعدازاں در شہور سنہ سبع و ثمانین وستمایہ در بغداد بصحبت شیخ نورالدین عبدالرحمٰن کسرقی رسید، در وقت مراجعت از حجاز، ودر سنہ تسع وثمانین وستمایہ اذن ارشاد یافت وبعد از سنہ عشرین وسبعمایہ در خانقاہ سکاکیہ در مدت شانزدہ سال صد وچہل اربعین برآورد۔

وگویند در سایر اوقات صد وسی اربعین دیگر برآوردہ است وچوں عمر وی بہفتاد وہفت سال رسید شب جمعہ بیست ودوم رجب ست وثلاثین وسبعمایہ در برج احرار صوفی آباد

بجوار رحمت حق پیوست ودر خطیرۂ قطب زماں عماد الدین عبدالوہاب مدفون گشت۔" (نفحات الانس ص ۴۳۹)

(۲) لطائف اشرفی کی جو تحریریں شیخ علاء الدولہ سمنانی سے منسوب ہیں وہ سب نفحات الانس اور شیخ کی کتاب العروہ یا چہل مجلس میں پائی جاتی ہیں، ممکن ہے یہ دونوں کتابیں لطائف اور نفحات دونوں کا ماخذ رہی ہوں، لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ نفحات میں وہی عبارتیں منتخب کی گئی ہیں جو لطائف میں بھی ہیں، انتخاب کی اس یکسانی کو محض ایک امر اتفاقی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) شیخ علاء الدولہ سمنانی اور شیخ عبدالرزاق کاشانی میں مسئلہ وحدۃ الوجود پر شدید اختلاف تھا، اس مسئلہ پر دونوں بزرگوں میں خط وکتابت ہوئی، شیخ کاشانی اور شیخ سمنانی کے مرید وخلیفہ اقبال سیستانی کے درمیان مسئلہ وحدۃ الوجود، شیخ ابن العربی (متوفی ۶۳۸ھ) اور شیخ علاء الدولہ سمنانی کے بارے میں استفسار ومذاکرہ ہوا، اس مذاکرے کے وقت حضرت سید اشرف بھی موجود تھے، اس گفتگو کی جو تفصیل حضرت سید اشرف نے بیان کی ہے بعینہ وہی نفحات الانس میں بھی منقول ہے، اس لیے اصل ماخذ ہونے کا دعویٰ لطائف اشرفی ہی کرسکتا ہے، اس گفتگو کی تفصیل حضرت سید اشرف نے اس طرح بیان کی ہے:۔

زبدۂ عقائد اصحاب تصوف وعمدۂ مواکد ارباب تعرف مسئلہ وحدۃ الوجود است واندک نزاعی کہ دریں مسئلہ بحضرت شیخ عبدالرزاق کاشی وحضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی افتادہ بنابر مصلحتی است ودر آں حین کہ ایں ہر دو اکابر یک دیگر را سال مکاتبات بہم دیگر کردند ایں فقیر وامیر اقبال سیستانی درمیان بودہ اند کہ در راہ سلطانیہ با شیخ عبدالرزاق امیر اقبال سیستانی ہمراہ بودند از ایشان استفسار آں معنی کردہ وے را دریں دادہ بہرہ تمام بود کہ شیخ تو در شان شیخ اکبر وسمنان وے چہ اعتقاد دارد؟ در جواب گفتہ کہ وی را مردی عظیم الشان

وعالی قدر رسیده اند و معارف وی را بسیاری می پسندد اما می فرماید که دریں سخن کہ حق را وجود مطلق گفتہ غلط کردہ ، اصل ہمہ معارف او خود ہمیں سخن است و ازیں بہتر سخنی نیست کہ شیخ تو ایں را انکار میکند و جملہ انبیاء و اولیاء و ائمہ برایں مذہب بودہ اند امیر اقبال ایں سخن را بشیخ خود نقل کردہ ، شیخ آنرا در جواب نوشتہ است کہ در جمیع ملل و نحل بدیں رسوائی سخن کس نگفتہ است و چوں نیک باز نگاہی مذہب طبایعیہ و دہریہ بسیار بہتر ازیں عقیدہ و امثال ایں در نفی و ابطال آں سخناں بسیار نوشتہ چوں ایں خبر بشیخ عبدالرزاق کاشی رسید بشیخ رکن الدین علاء الدولہ سمنانی مکتوبی نوشتہ و شیخ آنرا جواب نوشتہ جامع نکات ایشان ہر دو مکتوب را بعبارت آں پسندیدہ بکشان با شارت مبارک نقل کردہ و آں ایں است ۔"

(باقی)

رجال السند والہند (عربی)

اس میں ہند و سندھ کے اُن قابل ذکر ارباب کمال کا تذکرہ و تعارف کیا ہے ، جو ان علاقوں میں پیدا ہوئے یہیں زندگی گذاری ، یا پھر کسی غیر ملک میں گئے ، اور وہاں کی آب و ہوا ایسی دامنگیر ہوئی کہ وہیں سپرد خاک ہو گئے ، اسی طرح اس میں ان اہل علم کا بھی ذکر آگیا ہے جو تھے تو ہندی و سندی الاصل لیکن پیدا ملک کے باہر ہوئے ، اور وہیں ساری زندگی گذار دی ، اس میں پہلی صدی سے لیکر ساتویں صدی ہجری تک کے محدثین ، فقہا ، متکلمین ، مورخین ، شعراء و ادباء وغیرہ کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے ،

(از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری)

ضخامت ۳۲۸ صفحے ۔ قیمت :۔ عـہ ۱

منیجر

جگن ناتھ آزاد

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ، ایم ، اے

شبلی کالج کے ایک سابق طالب علم محمد ایوب واقف بی اے نے جگن ناتھ آزاد کے کلام کا انتخاب کیا ہے ، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس انتخاب پر تقریظ لکھوں ، شعر و شاعری پر میں بہت کم لکھتا ہوں ، اب سے کچھ پہلے فارسی شعرا میں تاج الدین ریزہ ، شہاب مہمرہ ، شمس دبیر اور امیر خسرو اور اردو شعرا میں اشرف علی فغاں ، بہادر شاہ ظفر ، جگر اور شاد عظیم آبادی پر کچھ خامہ فرسائی کی تھی ، لیکن ان شعراء پر لکھتے وقت ایسا محسوس ہوا کہ فارسی اور اردو شعراء کو میرے قلم کی ضرورت نہیں ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر میرے قلم سے معلوم نہیں بھلی بری کتنی تحریریں نکلتی رہی ہیں ، اور اب میں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا ہے کہ اس عہد کی تاریخ کے مختلف موضوعوں پر برابر کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا ، تاکہ اس عہد کے روشن پہلوؤں کا شائد واضح نقشہ سامنے آجائے ،

اس پابندی کے باوجود جب مجھ سے کہا گیا کہ میں جگن ناتھ آزاد پر لکھوں تو میرے دل نے کہا کہ ضرور کچھ لکھنا چاہیے ، کیوں ؟ میں خود نہیں بتا سکتا ، یہ ضرور ہے کہ جب کبھی جگن ناتھ آزاد غائبانہ طور پر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں جگن ناتھ آزاد سے ایک شاعر کی حیثیت سے متاثر ہوں یا ایک بہت ہی اچھے انسان کی حیثیت سے ان کی قدر کرتا ہوں ، یا ان کی درد بھری آواز کا گرویدہ ہوں یا ان تینوں خوبیوں نے ان میں جو مقناطیسیت پیدا کر دی ہے ، وہ دوسرے لوگوں کی طرح مجھکو بھی ان کی طرف کھینچتی ہے ۔

میں ان کا مداح اور معترف اُس وقت ہوا جب ۱۹۵۲ء میں ان کی نظم "بھارت کے مسلمان"
دہلی کے اخبار الجمعیۃ میں پڑھی، تقسیم ہند کے بعد یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑی پریشانی اور مایوسی کا
تھا، وہ طرح طرح کے مسائل و مصائب میں گھرے ہوئے تھے، جب یہ نظم شائع ہوئی تو ایسا معلوم
ہوا کہ کسی نے مسلمانوں کے زخم پر مرہم رکھ دیا ہے، اس میں مسلمانوں کی عظمت گذشتہ کی حدی خوانی
تھی، اور ایک للکار کے ساتھ رجز خوانی بھی، درد مند شاعر نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ
وہ دانش کدۂ دہر کی شمعِ فروزاں، مطلعِ تہذیب کے خورشید درخشاں، ازل سے درد محبت کے طلبگار،
مہر و مروت کے پرستار، لذت اسرار کے محرم، قاسم وسید کے خزانے کے نگہبان، بسطامی،
بصری، معری اور غزالی کے قصر و علم کے وارث ہیں، اجمیر کی درگاہ معلی، کلیر کے ذرات اور
ہانسی کی فضاؤں میں ان کے کیف کی تاثیر اب بھی موجود ہے، سرہند کی مٹی ان کے دم سے فروزاں ہے،
دلی کا ہر ذرہ ان کی ضو سے منور ہے، پنجاب کی مستی اور گنگوہ کی تقدیس ان ہی کی وجہ سے ہے۔
پھر یہ کہکر غیرت دلائی کہ وہ اسلام کی تعلیم اور تنظیم کو کیوں بھول بیٹھے ہیں۔

حیرت میں ہوں میں دیکھ کے یہ عالمِ نسیاں
بھارت کے مسلماں!

پھر مسلمانوں کو یہ کہکر ڈھارس دلائی

ممکن ہے کہ ساحل ہو پسِ پردۂ طوفاں
بھارت کے مسلماں!

اس شرافت اور اخوت کے جذبات سے بھری ہوئی اس نظم کو پڑھ کر قلبی تسکین اور ذہنی تسلی ہوئی
اور میں نے جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دار المصنفین کو یہ نظم دکھائی تو وہ بھی میری ہی طرح پڑھکر
بہت متاثر ہوئے، اور ہم دونوں نے طے کیا کہ اس کو معارف میں شائع کیا جائے، حالانکہ معارف میں

کوئی مطبوعہ چیز شائع نہیں ہوتی، چنانچہ فروری ۱۹۵۲ء کے معارف میں یہ نظم شائع ہوئی اور جناب
شاہ معین الدین صاحب ندوی نے اس پر یہ نوٹ بھی لکھا:

"یہ نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ
اس کا ثبوت ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع گل
نہیں ہوگئی ہے، اس نظم کی قدر و قیمت اس لیے اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اس کا لکھنے والا
گذشتہ انقلاب کا ستایا ہوا مغربی پنجاب کا ایک خانماں ہندو ہے، یہ نظم اس لائق ہے کہ
زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے گذرے، اس لیے اس کو اخبار الجمعیۃ سے نقل کیا جاتا
ہے، ہم کو امید ہے کہ انسانی اخوت و محبت کی اس آواز کا جواب پاکستان سے بھی دیا جائیگا۔"

یہ نظم معارف میں چھپی تو ہر حلقہ میں شوق سے پڑھی گئی اور "اعتراف و تشکر" کے عنوان سے
اس کے جواب میں یحیی اعظمی نے ایک نظم لکھی جو اگست ۱۹۵۲ء کے معارف میں چھپی، یہ گویا ہندستان
کے تمام مسلمانوں کی طرف سے اُن جذبات کا اظہار تھا جو ان کے دلوں میں اس نظم کے پڑھنے کے
بعد پیدا ہوئے، اس پوری نظم کو ایک "نغمۂ دلکش"، "نالۂ دل دوز"، "فغان اثر انگیز" اور "جگر سوز"
کہا گیا، جو بالکل صحیح ہے، یحیی صاحب نے جگن ناتھ آزاد کو مخاطب کر کے کہا

بھارت کے مسلماں پہ ہے یہ تیرا احساں — ممنون ترا کیوں نہ ہو بھارت کا مسلماں

اور اس کا بھی اعتراف کیا گیا کہ جگن ناتھ آزاد نے اپنی نظم سے مسلمانوں کو مدہوشی و غفلت سے جگایا، انکو بھولا ہوا سبق یاد دلایا،
ماضی کی روایات کا افسانہ سنایا، عظمت پارینہ کا راز بتایا، اسلام کی، قرآن کی اور ایمان کی تعلیم دی اور پھر یہ کہا

سنتا تھا جسے حاملِ قرآں کی زباں سے — وہ درس ملا اس کو ترے سوز فغاں سے

جگن ناتھ آزاد نے اپنے دل رنجور اور جذبۂ عالی سے مسلمانوں کے غم کی جو شرح کی تھی اس
کی ممنونیت کا اظہار اس طرح کیا،

حیرت ہے یہ آوازِ حق اس دورِ فتن میں ہے شکر کہ ایسے ہیں جواں اب بھی وطن میں

جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم معارف سے کراچی کے رسالہ دعوت الحق نے نقل کی، اور اس کو بہت ہی "پسندیدہ"، "ہمدردانہ" اور "مخلصانہ جذبات" سے معمور بتایا، پھر اس کے جواب میں اسد ملتانی نے اپنی ایک طویل نظم لکھی، اس میں جگن ناتھ آزاد کو انسان کی دل سوزی اور غمخواری کا پیکر کہا، اور ان کی نظم کے ہر نکتہ کو نشترِ فصاد سے بھی تیز، ہر حرف کو فکر و نظر کے لیے مہمیز اور ہر نغمہ کو ولولہ انگیز و جنوں خیز اور ہر شعر کو جذبۂ اخلاص سے لبریز بتایا، اور ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ

جس دور میں نازاں ہوں تعصب پہ زن و مرد جس دور میں ہر راہ سے نفرت کی اٹھے گرد

جس دور میں دل مہر و محبت سے ہوئے سرد اس دور میں موجود ہوں تجھ ایسے بھی ہمدرد

ہوں دیر میں یہ رنگِ حرم دیکھ کے حیراں ہمدرد مسلماں

جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ اسی سال جناب نیاز احمد صدیقی صاحب پرنسپل محمد حسن انٹر کالج جونپور نے اس کو علیحدہ چھپوایا، اور اپنے کالج کے سالانہ مشاعرہ میں اس کو مفت تقسیم کیا، اس مشاعرہ میں جگن ناتھ آزاد بھی شریک تھے، مشاعرہ میں یہ نظم حاضرین نے خود شاعر کی زبانی بھی سنی، میں بھی وہاں موجود تھا، اور جگن ناتھ آزاد کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، اور جب ان کی درد بھری آواز مشاعرہ میں سنی تو بار بار دل سوال کر رہا تھا کہ ان کی آواز زیادہ دل کش ہے یا ان کی شاعری، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ دونوں ہی دلکش ہیں، وہ اپنی درد بھری آواز میں جب یہ نظم سنا رہے تھے تو سامعین میں زندگی کے پورے آثار دکھائی دے رہے تھے، اور جب انھوں نے یہ سنایا

اور عزم سے پھر تھام ذرا دامنِ ایماں

بھارت کے مسلماں!

اور پھر یہ کہ

ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے ہوئے ساماں

بھارت کے مسلماں!

تو اسد ملتانی کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آ رہا تھا،

ہوں دیر میں یہ رنگِ حرم دیکھ کے حیراں

ہمدرد مسلماں!

اسی مشاعرہ میں انھوں نے اپنی وہ غزل بھی سنائی، جس کا مطلع یہ ہے:

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

یہ وہ غزل ہے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور جا کر ایک مشاعرہ میں پڑھی، ان کا مولد مغربی پنجاب کا ایک چھوٹا سا شہر عیسیٰ خیل ہے، لیکن ان کی نشو و نما لاہور میں ہوئی،

ان کو لاہور سے بڑی شیفتگی ہے، اس کو خیرباد کہنے کے بعد بھی ان کو اس کے جیسا شہر ہندوستان کیا یورپ میں بھی نظر نہ آیا، وہ اس کو تہذیب و ادب کی منزل گاہ، سینۂ پنجاب کا دل، بلدۂ مینو سواد اور جنتِ دیگر سمجھتے ہیں، ان کو اس کی بادِ صبح میں تاثیرِ شراب اور اس کے ذروں میں بجلیوں کی آب و تاب نظر آتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حالات کے تحت میں خود تو دہلی آ گیا لیکن میرا دل لاہور ہی میں رہا، مدتوں تک پارلیمنٹ اسٹریٹ کے بجائے مال روڈ کا نام زبان پر آیا، چاندنی چوک کا لفظ بڑی مشکل سے زبان پر چڑھا، بلا ارادہ جو نام زبان پر آتا تھا، وہ انارکلی کا تھا، بات جمنا کی ہوتی تھی تو زبان پر لفظ راوی کا ہوتا تھا،

اپنی نظر کا کیا علاج اپنی نظر کو کیا کروں اپنے چمن کو چھوڑ کر جم نہ سکی کہیں نظر

ان جذبات کے ساتھ جب وہ دہلی سے پہلی دفعہ لاہور پہنچے اور ایک مشاعرہ میں مذکورۂ بالا

غزل پڑھی تو اس غزل کا ہر شعر ان کے اصلی وطن کے ہجر و فراق میں ان کے خون دل کا ایک قطرہ اور ان کے آنسو کی ایک بوند معلوم ہوئی جس کا اعتراف خود لاہور والوں نے بھی کیا، عبدالمجید سالک مرحوم نے لکھا ہے، جب پاکستان نے اس شاعر کو دعوت دی کہ "پھر اپنی اجڑی انجمن کو واپس آ" تو لاہور کو جو شاعر کے نزدیک کعبۂ علم و فن ہے، مخاطب کرکے کہتا ہے

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو　　کہ اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

تمھارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا　　وطن کی صبح تک شام غریباں لے کے آیا ہوں"

عبدالمجید سالک کا یہ بھی بیان ہے کہ اس سادہ، سلیس اور سہل ممتنع غزل کو پاکستانیوں نے جتنی دفعہ آزاد کے پُر درد لہجے میں سنا ان کے دل میں ہوکیں اٹھیں،

عبدالمجید سالک کو اس کا بھی احساس رہا کہ جگن ناتھ کی شاعری تقسیم ہند کے بعد جذبۂ فراق وطن کی آہوں اور سسکیوں کی سرمایہ دار بن گئی، اور یہ خیال بالکل صحیح ہے،

آزاد اپنے نئے وطن ہندوستان کی عظمت کے ہر حال میں قائل ہیں، اس کو وہ خطۂ جنت نشان، سجدہ گاہ قدسیاں، منبع انوار حق، قبلۂ عرفانیاں، وقار علم و فن سمجھتے ہیں، بنارس کی صبح، اودھ کی شام، بنگال کی رعنائیاں اور پنجاب کی زیبائیاں دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں، ان کو فخر ہے کہ یہ کرشن، گوتم اور نانک کا گہوارہ رہا ہے، یہاں اجمیر کی درگاہ ہے، یہاں صابر عنبر چکاں اور کاکی گوہر فشاں رہے، یہ میر و غالب کا وطن ہے، یہاں علم و ہنر کا کارواں ایران سے آیا، اور اس کی فضا کو چمکا گیا، یہاں عرفی جیسا شیریں زبان، فیضی جیسا جادو بیان، مشہدی جیسا نکتہ داں، سرمد، کلیم اور آملی جیسے شاعران درفشاں، نیکو جیسا ہم زباں اور قاضی جیسا نغمہ خواں ہوا، غرض کہ ایک وطن سے محبت کرنے کے لیے جتنی چیزیں ان کے لیے ہونی چاہئیں، وہ سب ان کے لیے یہاں موجود ہیں، لیکن وہ جب کبھی اپنے پرانے وطن پاکستان کی طرف روانہ ہوئے تو ان میں جذبات کا طوفان امڈ پڑا ہے، وہ دہلی آنے کے بعد

پہلی دفعہ پاکستان کے قرب و جوار میں پہنچے تو ان کو یہ ارض وطن بھی ایک ارض پاک نظر آئی، ان کو یہاں بھی قطب عالم کا ضمیر تابناک، نور کا جوہر اور راگ میں عشق رقصاں دکھائی دیا، ان کو یہ سب اس لیے پسند ہے کہ یہ ہیر رانجھے کی زمین ہے، سوہنی و مہینوال کی بزم حسین ہے، وارث شاہ کی فکر کا مسکن ہے، یہ نانک کی نظر سے فیضیاب ہے، اس پر رام تیرتھ کا نور افشاں رہا ہے، اور پھر اس کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:

میں کہ تیرا ہی گل صد پارہ ہوں　　نکہت گل کی طرح آوارہ ہوں

دشت غربت میں وطن سے دور ہوں　　پھول ہوں اپنے چمن سے دور ہوں

اور جب وہ واگہ کی سرحد پر پہنچے تو ان کی پلکوں پر اشک رواں ہو گئے جو ہزاروں تلخ حقائق اور ہزاروں افسانے سنا رہے تھے، اسی عالم میں وہ کہہ اٹھے،

وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے　　خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

لیکن ان کا وطن ان کے غم سے بے خبر نہ تھا، اس لیے ان کے وطن کی روح بھی پکار اٹھی،

وطن کو بھولنے والے وطن کو واپس آ　　غزال دشت ختن پھر ختن کو واپس آ

اداس اداس ہیں پھولوں کے چہرہ ہائے جمیل　　تو اے بہار چمن پھر چمن کو واپس آ

ترے فراق میں گریاں ہے چشم راوی و سندھ　　اسی فضا اسی بزم کہن کو واپس آ

ان اپنی انجمن آرائیوں کی تجھ کو قسم

پھر اپنی اجڑی ہوئی انجمن کو واپس آ

اور جب وہ لاہور پہنچے تو پھر وہ غزل کہہ کر خود روئے اور سننے والے کو رلایا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے،

وہ اپنے معنوی استاد اقبال کی لحد پر بھی سلام کرنے لیے پہنچے، جن کو وہ ایک شاعر روشن ضمیر،

کاروانِ فکر تاباں کا امیر، محرمِ رازِ حیات، واقف سرِّ مقاماتِ حیات اور سینۂ مشرق کا قلبِ سلیم کہتے ہیں، اور ان کو یہ کہکر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں

تری نگاہ گئی بزم کہکشاں سے پرے — وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند

مہ و ستارہ و برق طپان دہر میں — تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں نہ کمند

اور پھر بڑی کشادہ دلی سے یہ اعتراف بھی کرتے ہیں

سکونِ صبح میں پایا ہے میں نے دل کو حضور — تمہے کلام میں پائی ہے میں نے دل کی کشاد

اور جب لاہور سے لائل پور جاتے ہیں تو اپنے پرانے ساتھیوں کو یاد کرکے بے چین ہو جاتے ہیں، ان کی نظریں ان کو ڈھونڈھتی ہیں مگر نہیں پاتیں،

جن کے طفیل باغ و بہاراں تھی زندگی — وہ دوست وہ حبیب نہ جانے کہاں گئے

ملتا نہیں چمن میں کہیں ان کا اب نشاں — اے بلبلو! تمہارے نشانے کہاں گئے

وہ اسی طرح راولپنڈی اور مری کو یاد کرکے اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہیں، ان کو حفیظ جالندھری کی یاد تڑپاتی ہے، فیض احمد فیض کو یاد کرکے بے قرار ہو جاتے ہیں، اب بھی احمد ندیم کو اپنے گوشۂ دل میں جگہ دیے ہوئے ہیں، ممتاز حسین کو اپنی نگاہوں کے سامنے پاتے ہیں، ان کو دکھ ہے کہ وہ ظہیر کاشمیری سے بچھڑ گئے، وہ عبد العزیز فطرت، اظہر امرت سری، ضیا سرحدی، نما قریشی، بفضل الرحمٰن اشک، وقار انبالوی، عبد المجید سالک مرحوم، مولانا ظفر علی خاں مرحوم، حامد علی خاں، حفیظ ہوشیار پوری، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبد اللہ، عاشق بٹالوی، باری علیگ، چراغ حسن حسرت مرحوم، اختر شیرانی مرحوم، احسان دانش، محمد اقبال (وائس پرنسپل اورینٹیل کالج) سید حامد علی، صوفی غلام تبسم کی گذشتہ صحبتوں کی یادوں کے چراغ اب بھی اپنے دل میں روشن کیے ہوئے ہیں، جیسا کہ ان کی نظم جمنا کے کنارے (۱۹۴۷ء) اور کچھ میرے گوشۂ روز و شب

سے ظاہر ہوگا۔

اس سلسلہ میں ان کی نظموں میں وہ نظم زیادہ قابلِ توجہ ہے جو انھوں نے اپنے استاد تاجور نجیب آبادی کے مزار پر پہنچ کر کہی تھی، ان کو تاجور نجیب آبادی سے بڑی عقیدت تھی، جن کے افکار سے انھوں نے پورا فیض اٹھایا، تاجور بھی ان کو اپنا "پسر" اور "نورِ نظر" ہی سمجھتے رہے، مزار پر آزاد اپنے گوشِ دل سے اپنے استاد کی نصیحت سنتے ہیں کہ وہ کبھی اور باغ کے پھول تھے لیکن کسی اور جگہ جاکر مہکے، اب ان کی تہذیب کی انجمن ایک نئی دنیا ضرور ہوگئی ہے لیکن کسی حال میں ان کا گزر تنگیِ دل کی طرف نہ ہو اور افکار کی پستی اس کے دل کے مسکن میں نہ ہو، اور نارواداری کا کانٹا اس کے گلشن میں نہ ہو، اس کے بعد کے ٹکڑے یہ ہیں

ہند میں مسلم کو بیگانہ کوئی کہنے نہ پائے — یہ غلط بنیاد افسانہ کوئی کہنے نہ پائے

اس طرح مسلم رہے ہندوستاں کی گود میں — جس طرح رہتا ہے بچہ اپنی ماں کی گود میں

بے خطر ہو جان بھی مسلم کی اور ایمان بھی — مال بھی اس کا حفاظت میں ہو اسکی آن بھی

اس کے بعد جو اشعار ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اندرونی جذبات اور حقیقی احساسات کی بالکل صحیح ترجمانی اور آئینہ داری ہے، شاعر نے گویا مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھ کر یہ بات لکھی ہے،

یہ تحفظ ہو تو پھر اس کی وفاداری کو دیکھ — دیکھ اپنے خون سے پھر اسکی گلکاری کو دیکھ

جاں لڑا دیگا یہ خود ہندوستاں کے واسطے — جس طرح مٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے

یہ سراسر پیکرِ جذبات ہے دیوانہ ہے — شمع ہو اخلاص کی روشن تو یہ پروانہ ہے

اس طرح مرتا ہے یہ جذبہ وفا کے نام پر — عورتیں جس طرح مرتی ہیں حیا کے نام پر

اس کی نظرت سے پرے ہے عصرِ نو کے جوڑ توڑ — اس کو اپنا کہہ تو پھر جس طرح چاہے اسکو موڑ

شرط صرف اتنی ہے اس کو اسقدر احساس ہو — بس یقیں کا اسقدر سرمایہ اسکے پاس ہو

اس وطن میں اک حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں

یہ اسی گلشن کا ہے اک پھول بیگانہ نہیں

اوپر کے تمام اشعار کو پڑھکر گمان ہوتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد ہندوستانی ہونے کے بعد بھی پاکستانی ہیں، ہندوستان کے سیاسی اخلاق میں کسی ہندوستانی کا پاکستانی ہونا بہت بڑا جرم ہے لیکن جگن ناتھ آزاد کے لیے یہ بڑا وصف ہے، ہندوستان میں پاکستان کے خلاف نفرت، پاکستان میں ہندوستان سے بیزاری کو وطن دوستی سمجھا جاتا ہے، ایسے ماحول میں جگن ناتھ آزاد نے پاکستانی بن کر جن تمر نغمے جذبات سے اخلاص، محبت، مروت، مودت، انسانیت، ہمدردی، دلنوازی، دلداری، دردمندی، فراخدلی اور وسیع المشربی کی قدروں کو ابھارا ہے، وہ سیاسی معاہدوں اور تحفظات سے زیادہ موثر ہیں، اور ان ہی کے ذریعہ سے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جاسکتے ہیں،

اس سلسلہ میں آزاد کو جو تھوڑی بہت کامیابی ہوئی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں سنیے:

مشاعروں کے سلسلہ میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق کئی بار ہوا، بعض دفعہ تو سال میں تین تین چار چار چکر بھی لگے لیکن ہر بار جاکر تشنگی بڑھتی ہی رہی، یوں تو میرا سارا کلام ان ہی تاثرات سے لبریز ہے، لیکن طویل نظم "وطن میں اجنبی" کا پس منظر خاص طور سے یہی ہے، اس نظم کی تشکیل میں لاہور اور راولپنڈی سے میرا احساس جدائی ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اس پذیرائی اور محبت کا ردعمل بھی جاری و ساری ہے جس کا احساس مجھے مغربی اور مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں متعدد بار جاکر ہوا، یہ شہر صرف لاہور اور راولپنڈی ہی نہیں، بلکہ کراچی، ملتان، لائل پور، اور حیدرآباد کے علاوہ مشرقی پاکستان کے بعض شہر مثلاً ڈھاکہ، نرائن گنج، چٹاگانگ اور کھلنا وغیرہ بھی اس فہرست میں شامل ہیں جن کے ساتھ تقسیم ہند سے پہلے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

اتنے ہی پر آزاد اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے تاثرات کا اظہار اور بھی واضح الفاظ میں کرتے ہیں:

"ہر مشاعرہ سے میں یہ تاثر لے کر آیا کہ تقسیم کے باوجود کوئی نہ کوئی رشتۂ مودت ایسا ہے جو ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ کیے ہوئے ہے، خدا جانے اس کا سبب وہ انسان دوستی ہے جس سے اردو کا خمیر اٹھا ہے یا پاکستان والوں کا وہ جذبۂ مہمان نوازی ہے جس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم فرما گئے ہیں

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

لیکن کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جو اتنی تقسیم کے باوجود دلوں کو آپس میں ملائے ہوئے ہے۔"

اور یہ کوئی نہ کوئی بات" زیادہ چھپی ڈھکی نہیں ہے، آزاد دلدار اور دلنواز بنکر گئے تو ان کو بھی دلداری اور دلنوازی ملی، اس جنس کی جہاں بھی کمی ہوگی وہاں شرافت اور محبت کا بھی فقدان ہوگا، ہندوستان یا پاکستان جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں، ان کی فطرت کا صحیح اندازہ خود آزاد نے لگایا ہے کہ وہ سراسر جذبات ہوتے ہیں، اگر ان کو اخلاص کی شمع کہیں مل جاتی ہے تو وہ دیوانہ وار اس کے پروانے بنجاتے ہیں، اور جذبۂ وفا کے نام پر اس طرح مرتے ہیں، جس طرح عورتیں حیا کے نام پر مرتی ہیں، آزاد نے پاکستان میں جاکر اخلاص کی شمع روشن کی تو پروانے بھی جمع ہو گئے، خود ان کی وفا کو دیکھ کر پاکستان کا بھی جذبۂ وفا بیدار ہوا، آزاد کی حسب ذیل تحریروں کی دل لگی کی بات سے دل لگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

"میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مشاعرہ میں شرکت کے بعد دہلی واپس آرہا تھا، میرے دوست محمد طفیل مدیر نقوش نے مجھے رخصت کرتے وقت مٹھائی کا ڈبہ دیتے ہوئے کہا تمھیں تو ہم یوں رخصت کرتے ہیں جیسے بیٹی کو گھر سے رخصت کر[illegible] جا[illegible]"

ایک ہندوستانی ہندو اور ایک پاکستانی مسلمان کے [illegible]ت سیاسی اور

وقتی مصلحتوں سے نہیں پیدا ہو سکتے ہیں بلکہ اسی وقت ابھر سکتے ہیں جب دونوں کے دلوں کے پیمانے شراب محبت سے لبریز ہوں، ان دونوں کے دلوں میں محبت کی ارغوانی شراب بھری ہوئی تھی جو لنے سے ابل پڑی، ہندوستان و پاکستان کے لوگوں کے ہاتھوں میں جب محبت کے مینا و ساغر ہوں گے، تب ہی دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں،

اس لحاظ سے جگن ناتھ آزاد ہندوستان و پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات کے قابل قدر قاصد کہلانے کے مستحق ہیں لیکن اس وقت جب کہ تعصب، نفرت اور عداوت کا طوفان دونوں طرف امنڈ رہا ہے، ان کے شریفانہ جذبات کی قدر نہیں ہو سکتی، اور ان کو خود اس کا احساس ہے

جنوں کار فرما ہو جہاں اطراف عالم میں — وہاں ہم عقل کی محفل سجائیں بھی تو کیا ہوگا،
جہاں احول پر نفرت ہی نفرت راج کرتی ہو — وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہوگا

پھر بھی انھوں نے "عزم کی مشعل" ہاتھ میں لے کر اپنے دل ہی کو اپنا راہ نما بنایا ہے، یہ لکھتے وقت بے اختیار قلم سے یہ بات نکل رہی ہے، کہ آزاد کے اس عزم اور رہنمائی میں وہی روح کام کر رہی ہے، جو آج سے ساڑھے سات سو برس پہلے امیر خسرو کی بعض مثنویوں اور نظموں پر چھائی ہوئی تھی، ان دونوں کا موازنہ ہرگز مقصود نہیں، لیکن یہ لکھے بغیر بھی نہیں رہا جاتا ہے کہ امیر خسرو عشق الٰہی عشق رسول اور عشق مرشد کے کشتہ ہوتے ہوئے بھی وطن کی محبت میں شاعرانہ زبان میں پکار اٹھے تھے۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند — آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

اسی طرح جگن ناتھ آزاد ہندوستانی ہو کر پاکستان کی محبت میں سرشار ہیں، وہ بھی امیر خسرو کی طرح کہہ گئے ہیں:

نہ فریب دے مجھے دیر کا نہ طلسم حرم دکھا — میں پرے ہوں دیر و حرم سے اب مجھے شوقِ دید حرم نہیں

امیر خسرو جب دہلی سے کچھ دنوں کے لیے باہر جاتے اور واپس آتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ایک پرندہ خزاں کی صعوبتیں برداشت کر کے پھر ایک پُر بہار باغ میں پہنچ گیا ہے، وہ دہلی کو جنت عدن اور باغ ارم سمجھتے تھے، ان کو دہلی کی گرم ہوا بھی پسند تھی، غایت محبت میں اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آفتاب کو اس زمین سے عشق ہے، عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہو گئی ہے، وہ دہلی کو بغداد، مصر، خطا، خراسان، تبریز، ترمذ، بخارا اور خوارزم وغیرہ پر ترجیح دیتے ہیں، اسی طرح جگن ناتھ کو اگر لاہور یورپ کے تمام شہروں سے زیادہ خوبصورت نظر آیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں، وطن پرستی کا یہ جذبہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے،

یہ لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ خسرو جن سلاطین سے وابستہ رہے، انھوں نے جنگ کے سلسلہ میں ہندو راجاؤں کے خلاف بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں، جن میں ہر طرح کی خونریزی اور غارت گری ہوئی، اس کے باوجود خسرو کو ہندوؤں سے محبت رہی، اس لیے کہ وہ ان کے ہم وطن تھے، وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں لکھتے ہیں کہ ہندو آگ کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ اس میں امید وصل فروزاں رہتی ہے، اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے، خسرو نے اس جذبہ کی قدر کرنے کا مشورہ دیا ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندو مرد اور عورت دونوں میں وفا شعاری کا جذبہ ہوتا ہے، ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے؛ ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لیے جان کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا ہے لیکن یہ بڑی کارگذاری ہے، اگر اسلام اس کی اجازت دیتا تو بہت سے مسلمان اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کر دیتے۔

جگن ناتھ آزاد نے بھی اپنی آنکھوں سے ہندو مسلمان کے درمیان خونریزی اور فسادات دیکھے ہیں، دھرم اور مذہب کی دنیا میں تہذیب کو جنون کی لہر میں بہتے دیکھا ہے، معین الدین چشتیؒ کی زمین پر اور کرشن کے گھر میں شر کو الم کی داستان کہتے ہوئے سنا ہے، امن و وفا کی جس زمین میں گرو نانک نے اپنے دلنشین نغمات سنائے تھے، وہاں ابن آدم کو ایسے افعال زبوں کرتے ہوئے دیکھا جن سے درندوں کو کیا ابلیس کو بھی شرم آئے، پھر جہاں قاضی نذر الاسلام کے پیار کے ترانے گائے گئے، وہاں جنون انگیز نعرے بلند ہوئے، جہاں ٹیگور کا جام وفا چھلکتا رہا وہاں انسان کے خون کی بارش ہوئی، ان نظاروں کو دیکھنے کے باوجود جگن ناتھ آزاد کا دل خسرو کی طرح اپنے ہموطنوں کی محبت سے سرشار رہا، جس طرح خسرو اپنے ہندو ہموطنوں کی اچھائیوں کے معترف رہے، اسی طرح آزاد بھی اپنے مسلمان ہموطنوں کی خوبیوں کا راگ الاپتے ہیں، خسرو نے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کی بت پرستی میں اخلاص، وفا اور امید وصل کی شمع کو فروزاں پایا، تو جگن ناتھ آزاد نے بھی ہندو ہونے کے باوجود اسلام کی تعلیم میں مہر، محبت، اخلاص، مروت، صداقت کی حقیقت کو فروزاں دیکھا،

اسلام تو مہر اور محبت کا بیان ہے   اخلاص کی رُوداد مروت کا بیاں ہے

ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے   اک زندہ و پایندہ حقیقت کا بیاں ہے

کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں

بھارت کے مسلماں

جس طرح خسرو عورتوں اور مردوں کے جذبۂ وفا شعاری کے مداح رہے، اسی طرح جگن ناتھ آزاد کو بھی اس کا احساس ہے کہ ایک مسلمان جذبۂ وفا کے نام پر اس طرح مرتا ہے جس طرح عورتیں حیا کے نام پر مرتی ہیں، جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم پہلے ناظرین کی نظر سے گزر چکی ہے۔

خسرو فارسی کے جلیل القدر شاعر تھے، فارسی ان کی مادری زبان تھی لیکن وہ ہندوستان

کی تمام زبانوں مثلاً سنسکرت، ہندی، سندھی، دھور سمندری، تلنگی، گجری، گوری، بنگالی، اودھی وغیرہ کے بھی رمز شناس تھے، جیسا کہ انھوں نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے، فارسی کے مقابلہ میں دوسری زبانوں سے تعصب اس لیے پسند نہیں کیا کہ وہ اس زبان کے شاعر ہیں یا یہ انکی مادری زبان ہے یا اس وقت کی سرکاری زبان تھی، وہ دل کھول کر ہندوستانی زبانوں کی تعریف کرتے ہیں، اپنی مثنوی نہ سپہر میں اعتراف کرتے ہیں کہ سنسکرت فارسی سے برتر زبان ہے، ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے، اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں

چو من طوطی ہندم ار است پرسی   ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ شور و غل کہ میری زبان دوسروں کی زبان سے بہتر ہے یا وہی شربت قند ہے اور دوسری اس کے ایک بیہودہ گفتگو ہے،

جس جذبہ نے خسرو کو ہندوستان کی زبانوں میں سنسکرت اور ہندی سے محبت کرنا سکھایا، اسی جذبہ نے جگن ناتھ آزاد کو بھی اردو کا قدردان بنایا، وہ لکھتے ہیں:

"میری مادری زبان پنجابی ہے لیکن اوڑھنا بچھونا اردو ہے..... اس زبان کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جس کی ترقی میں مجھے ہندوستان کی ترقی پنہاں نظر آتی ہے اردو کی ادبی روایات کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتا ہوں، اور ایک محب وطن ہندوستانی کی حیثیت سے ان پر فخر کرتا ہوں"

ان کو اردو سے صرف اس لیے محبت نہیں کہ وہ اس زبان میں شعر کہتے ہیں اور اسی کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو پڑھنے والوں اور سننے والوں تک پہنچا دیتے ہیں، بلکہ اس لیے بھی اسکے قائل ہیں کہ ان کو اس کے طرز تکلم میں اخلاص اور بولی میں پیار محسوس ہوتا ہے

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی   یہ ہے اخلاص کی طرز تکلم پیار کی بولی

ان کو اس سے اس لیے بھی محبت ہے کہ یہ ہندوؤں کی بھی زبان ہے، اس دعوے کے ثبوت میں اپنی نظم اردو میں ان تمام ہندو شاعروں، افسانہ نویسوں، ناول نگاروں، مصنفوں اور مقالہ نگاروں کا ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے چمن اردو کی آبیاری کی ہے، ہم بھی ان کے ناموں کی محض فہرست یہاں پر درج کرتے ہیں، تاکہ ناظرین متحیر ہو کر ان کے نام پڑھیں، اور پھر ان کے کارناموں کو جاننے کی کوشش کریں۔

مہاراج بہادر برق، برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور، رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، رگھوپتی سہائے فراق، ہرگوپال تفتہ، تلوک چند محروم، میلا رام وفا، ہری چند اختر، عرش ملسیانی، جوش ملسیانی، پریم چند نظر، پنڈت یوک راج نظر، بشیشور پرشاد منور، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد افق، سورج نرائن مہر، گوپی ناتھ امن، دیا نرائن نگم، جواہر سنگھ جوہر، مہاراجہ کشن پرشاد، گنگا پرشاد اوج، دینا ناتھ متحیر، راجہ نول رائے وفا، کنہیا لال دل، انند رام مخلص، گنگا رام تسلی، جگت موہن لال رواں، جانکی ناتھ مدن، امر ناتھ ساحر، رائے سرپ سنگھ دیوانہ، راجہ جسونت سنگھ پروانہ، پھمن پرشاد صدر، مادھو رام جوہر، بنواری لال شعلہ، چندر بھان برہمن، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، کنہیا لال کپور، مہندر ناتھ اشک، رام انند ساگر، بلونت سنگھ، کرشن چندر، ستیارتھی، دیوتی سرن شرما، مخمور جالندھری، نرش کمار شاد، گوپال متل، تاجور سامری، ذکر تونسوی، رام کرشن مضطر، کنار سنگھ دگل، انند نرائن ملا، پرکاش پنڈت، ہنس راج رہبر، رام چند سنگھ شیدا، اور پنڈت برج موہن کیفی۔

آزاد نے ان ناموں کے ذکر میں کسی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا ہے، بلکہ جیسے جیسے ان کے نام ان کے خیال میں آتے گئے، وہ نظم میں شامل کرتے گئے، لیکن جس اختصار سے ان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ایجاز کی ایک روشن مثال ہے۔

(باقی)

مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاعِ مشرقی سے

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

(۱) مولانا شیخ حسن بن طاہر جونپوری ۹۰۹ھ خلیفہ راجہ سید حامد مانک پوری

مولانا شیخ حسن بن طاہر عباسی جونپوری بڑے عالم و فقیہ اور ہندوستان کے مشہور مشائخ میں سے ہیں، بہار میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے تحصیل علم کا شوق تھا، اس زمانہ میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے جونپوری تلامذہ کا شہرہ دور دور تک تھا، اور اہل طلب ادھر کا رخ کر رہے تھے، اس لیے آپ نے بھی اپنے والد کے ہمراہ جونپور آکر، ان بزرگوں سے پڑھ کر علوم دینیہ میں کمال حاصل کیا، اس کے بعد راجہ سید حامد شاہ مانک پوری سے طریقۂ چشتیہ حاصل کیا، شیخ نے اپنے مرید و خلیفہ کو کمال الحق کا لقب دیکر فرمایا کہ حسن قیامت تک حجت ہیں، سکندر لودھی کے عہد حکومت میں جونپور سے آگرہ چلے آگئے، پھر وہاں سے دہلی جاکر مقیم ہوگئے، اور وہیں ربیع الاول ۹۰۹ھ میں وفات پائی۔

آپ کے تلامذہ و مریدین میں قاضی خان ظفرآبادی ۹۵۹ھ کبار مشائخ چشتیہ میں ہیں، ستر سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فارغ ہوکر شیخ حسن بن طاہر کی خدمت میں تیس سال تک رہے، اور علم طریقت حاصل کیا، شیخ سالار بن ہبۃ الدین کوڑوی ۹۴۶ھ نے بھی شیخ حسن ہی سے خرقۂ خلافت پہنا، اور آپ کے صاحبزادے مولانا شیخ محمد بن حسن بن طاہر حنفی جونپوری ۹۲۶ھ نامور فقیہ و محدث گذرے ہیں، حرمین شریفین اور یمن کا سفر کرکے علم و طریقت کی تحصیل کی اور واپس آکر دہلی میں سکونت

اختیار کی، ان کے تلامذہ میں شیخ عبدالرزاق جھنجھانویؒ اور شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

(۲) شیخ بہاء الدین جونپوری ۹۱۱ھ خلیفہ راجہ سید حامد مانک پوری

شیخ بہاء الدین بن خلق اللہ بن مبارک عمری جونپوریؒ نے مولانا محمد بن عیسیٰ جونپوریؒ سے دینی علوم حاصل کیے، اور نو سال تک راجہ سید حامد مانک پوری کی خدمت وصحبت میں رہ کر طریقت حاصل کی، نیز دوسرے اساتذہ و شیوخ سے فیض اٹھایا، تیس سال سے زیادہ مکہ مکرمہ میں رہے، جبل ابوقبیس کے ایک زاویہ میں رہتے تھے، اور ہر نماز کے لیے حرم شریف آتے تھے، اس مدت میں وہاں کے علماء و محدثین اور شیوخ سے علم و معرفت کی تحصیل فرماتے رہے، بڑے محدث و فقیہ تھے، سو سال سے زائد تک تندرست و توانا رہ کر رمضان ۹۱۱ھ میں وفات پائی،

آپ کے خلفاء میں شیخ علی بن قوام الدین میر علی عاشقان (سرائے میر) متوفی ۹۵۵ھ بہت مشہور ہیں، آپ طریقہ عشقیہ میں اپنے زمانہ کے یکتا بزرگ اور صاحب جذب و تصرف شیخ تھے، طریقہ شطاریہ شیخ عبدالقدوس نظام آبادیؒ سے حاصل کیا تھا، ۶ صفر ۹۵۵ھ میں سرائے میر (اعظم گڈھ) میں انتقال فرمایا۔

میر علی عاشقان کے خلفاء و مریدین میں شیخ مبارک بن خیر الدین الٰہی جونپوری ۹۰۳ھ خاص مقام رکھتے ہیں، آپ نے ایک مدت تک اپنے شیخ کی خدمت وصحبت میں رہ کر مشیخت حاصل کی، انکے والد شیخ خیر الدین ظفرآباد سے اہل (اعظم گڈھ) میں آکر آباد ہو گئے، اور قریب ہی خیر الدین پور نامی گاؤں بسا کر اب بیٹے رہتے تھے، شیخ مبارک سے مولانا محمد درویش جونپوری غازیپوری ۹۹۰ھ نے تعلیم حاصل کی، ان کا وطن نونہرہ (غازیپور) تھا، طلب علم میں جونپور آئے، اور شیخ مبارک کے زاویہ میں رہ کر ایسی تعلیم حاصل کی کہ درس و تدریس اور افتا میں یکتا بنکر نکلے، شیخ مبارک نے ان سے اپنی بیٹی کی شادی بھی کر دی تھی، وہ جونپور میں رہ بس گئے۔

(۳) مولانا شیخ الہداد جونپوری ۹۲۳ھ خلیفہ راجہ حامد مانک پوری

مولانا شیخ الہداد بن عبداللہ حنفی جونپوری اسکندر بن بہلول لودی کے دور کے علماء کبار میں سے تھے، مولانا عبدالملک جونپوری

سے تحصیل علم کی، استاذ کی زندگی ہی میں علماء کبار میں شمار ہو گیا، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کے ساتھ مشیخت و طریقت میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، طریقہ چشتیہ راجہ سید حامد سے حاصل کیا تھا، اور ان کے خلیفہ تھے، ایک مرتبہ ان کو بادشاہ وقت نے جونپور سے دہلی بلاکر بعض علماء سے بحث و مناظرہ کرایا، جس میں آپ کامیاب رہے، آپ نے کئی درسی کتابوں کی شرح و تعلیق کی ہے، ۹۲۳ھ میں وفات پائی،

مولانا الہداد کے شاگردوں اور مریدوں میں مولانا شیخ معروف بن عبدالواسع جونپوریؒ بہت مشہور ہیں، انھوں نے شیخ الہداد سے علوم دینیہ اور سلوک و طریقت کی تعلیم حاصل کی اور تیس سال درس و تدریس اور عبادت و ریاضت میں بسر کئے، طریقہ چشتیہ میں مولانا الہداد کے مرید تھے، اور طرق قادریہ و شطاریہ شیخ محمد بن عبدالعزیز جونپوریؒ سے حاصل کیے تھے، شیخ احمد بن زین جونپوریؒ، شیخ نظام الدین امیٹھویؒ، اور مفتی آدم بن محمد گوپامئوی نے شیخ معروفؒ سے طریقت کی تعلیم و تربیت پائی تھی، شیخ احمد بن زین ۹۶۳ھ نے شیخ معروف سے تعلیم حاصل کی اور مدتوں ان کی خدمت وصحبت میں رہ کر مرتبہ کمال کو پہنچے، شیخ نظام الدین امیٹھوی ۹۷۹ھ نے جونپور میں شیخ معروفؒ سے پڑھا اور ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں رہے، اور شیخ مفتی آدم بن محمد گوپامئویؒ ۱۰۰۱ھ نے بھی شیخ معروفؒ سے شریعت اور طریقت دونوں کے علوم سیکھے، فقہ حنفی کے زبردست عالم و فقیہ اور گوپامئو کے قاضی تھے،

شیخ دانیال جونپوری خلیفہ راجہ سید حامد مانکپوری

شیخ دانیال بن حسن جونپوریؒ ۹۹۲ھ انجی الاصل تھے، ہندوستان آکر پہلے شاہان دہلی کے دربار سے منسلک رہے، پھر مانک پور جاکر راجہ سید حامد شاہ سے طریقہ چشتیہ حاصل کیا، وہاں سے بنارس گئے، آخر میں جونپور آکر تدریس و افادہ میں مشغول ہو گئے، یہاں ان سے شیخ محمد بن یوسف حسینی جونپوری اور شیخ احمد بن یوسف حسینی جونپوری دونوں

بھائیوں نے اکتساب علم و فضل کیا، شیخ احمدؒ نے مقالات احمدیہ نامی کتاب میں اپنے شیخ و مرشد مولانا دانیال کے ملفوظات جمع کیے، نیز سید محمد مہدی جونپوری ۹۷۳ھ نے شیخ دانیال سے پڑھا اور طریقت حاصل کرکے مدتوں مجاہدہ و ریاضت کی زندگی بسر کی،

راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانکپوری ۹۲۱ھ اور ان کے خلفاء بلاد پورب میں

راجہ سید نور عنفوان شباب ہی میں شیخ حسام الدین مانک پوری اور اپنے والد راجہ سید حامد شاہ کی توجہ اور کوشش سے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئے تھے، صاحب اخبار الاصفیاء کا بیان ہے کہ

"گویند چوں وے از حرابۂ عدم بمعمورۂ وجود آمد، شیخ حسام الدین براجہ حامد شہ فرمود کہ ایں نوبادۂ بوستانِ سعادت قطب وقت خواہد بود، در استکمال او سعی بلیغ بجا آرید، راجی حامد شہ در عنفوانِ حال از علوم ظاہری و از آداب سلوک و ہدایت بہرہ مند ساختہ براو رنگ خلافتِ خود کامرو اگردانیدہ از جہاں گذشت۔" (قلمی ورق ۸۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید نور اپنے والد کے وصال (سنہ ۹۰۱ھ) کے نوجوان تھے اور مرتبۂ کمال کو پہنچ چکے تھے، انھوں نے بہلول شاہ لودی اور سکندر بن بہلول شاہ لودی کا زمانہ پایا تھا، ان کے صاحبزادے راجہ سید احمد بن نور تھے، مگر ان کا مستقل تذکرہ نہ مل سکا۔ ان کے مشہور خلفاء جن سے خطۂ پورب فیض یاب ہوا تین ہیں، (۱) شیخ دتن بن احمد جونپوریؒ ۹۴۲ھ (۲) شیخ نظام الدین امیٹھوی سنہ ۹۷۹ھ (۳) شیخ جلال الدین بن صدر الدین اکبرآبادی اودھی ۹۶۹ھ۔

شیخ دتن کا نام الہداد تھا، مگر دتن کے نام سے مشہور تھے، دینی علوم سے بہرہ مند تھے، مشائخ چشتیہ میں بڑے مرتبے کے بزرگ تھے، راجہ سید نور کی صحبت میں رہ کر چمکے، آپ کے خلفاء میں شیخ جلال الدینؒ بھی شامل ہیں، جو براہ راست آپ کے مرشد راجہ سید نور کے خلیفہ ہیں،

شیخ نظام الدین امیٹھوی عالم و فقیہ اور عابد و زاہد تھے، مشائخ چشتیہ میں انکا بڑا مقام تھا،

سنہ ۹۰۹ھ میں امیٹھی میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے تحصیل علم کا شوق تھا، جونپور جاکر شیخ معروف جونپوری کی خدمت میں ایک مدت تک رہ کر تحصیل علم کی، پھر مانک پور جاکر راجہ سید نور سے طریقت میں مرتبۂ کمال کو پہنچے، اور وہاں سے جونپور آئے، اس کے بعد اپنے وطن واپس گئے، آپ علم اور معرفت دونوں میں اپنے زمانہ کے امام تھے۔

شیخ جلال الدین بن صدر الدین اکبرآبادی اودھیؒ، اودھ میں سنہ ۸۹۰ھ میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان پہلے سے علم، دینداری، اور طریقت میں مشہور تھا، کبار مشائخ میں سے تھے، راجہ سید نور سے طریقۂ چشتیہ حاصل کیا تھا، مدت دراز تک امراء و سلاطین کی خدمت میں رہے، پھر ترک و تجرد کی زندگی اختیار کی، اور شہر پور (فیض آباد) میں مستقل قیام کرکے شیخ الہداد احمد شریعت کی خدمت میں چار سال تک کسب فیض کیا، آخر میں آگرہ میں سکونت اختیار کی، اور وہیں ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۹۶۹ھ میں فوت ہوئے، آپ کے صاحبزادے شیخ بدرالدین اور دوسرے مشائخ نے آپ سے روحانی فیض اٹھایا۔

راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بلاد پورب میں

راجہ سید نور کے ایک صاحبزادے راجہ سید احمد کا نام کتابوں میں ملتا ہے، جن کو گلزار ابرار میں محمود بتایا گیا ہے، مگر افسوس کہ ابتک ان کے حالات نہ مل سکے، اسی طرح راجہ سید احمد کے صاحبزادے راجہ سید مبارک کے حالات بھی معلوم نہیں ہوسکے، مگر بعض قرائن و شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے جونپور سے آگے پرگنہ محمد آباد میں آمد و رفت اور سکونت جاری رکھی، حتی کہ محمد آبادی مشہور ہوئے اور اسی پرگنہ میں قاسم آباد نامی ایک قدیم بستی کی جگہ اپنے نام سے قصبہ مبارکپور آباد کیا، وہ دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں موجود تھے، اس حساب سے تیموری سلاطین میں بابر متوفی سنہ ۹۳۷ھ اور ہمایوں متوفی سنہ ۹۶۳ھ کا زمانہ پایا تھا، اور عجب کیا ہے کہ اکبر متوفی سنہ ۱۰۱۴ھ کا کچھ زمانہ بھی انکو ملا ہو،

راجہ سید مبارک کے دو صاحبزادوں راجہ سید مصطفےٰ اور راجہ سید مجتبیٰ میں سے کسی کے خطۂ پورب سے تعلق رکھنے کا پتہ نہیں چلتا، راجہ سید مصطفےٰ اکبر بادشاہ کے جلو میں نظر آتے ہیں، ان کے صاحبزادے راجہ سید محمد کے بارے میں بھی معلوم نہیں کہ پورب سے ان کا کوئی تعلق تھا، راجہ سید مجتبیٰ کے حالات بھی مخفی ہیں، البتہ ان کے صاحبزادے راجہ سید احمد بن راجہ سید مجتبیٰ کے حالات ملتے ہیں، اور دیار پورب سے ان کے تعلق کا بھی پتہ چلتا ہے،

راجہ سید احمد بن راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارک بلاد پورب میں

آپ احمد حلیم کے نام سے مشہور ہیں، آپ نے اپنے والد راجہ سید مجتبیٰ سے تعلیم و تربیت حاصل کی، سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ دونوں میں کامل تھے، ۱۰۴۳ھ میں وفات پائی، آپ نے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا ابتدائی زمانہ پایا ہے، آپ کے خلفاء میں حضرت دیوان محمد رشید جونپوری ۱۰۸۳ھ بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ ہیں، طریقہ چشتیہ اور طریقہ سہروردیہ دونوں میں راجہ سید احمد کے خلیفہ تھے، دیوان محمد رشید کے خلفاء میں صاحب سماتُ الاخیار نے سید محی الدین محمد آبادی کا نام لکھا ہے، ان کے حالات معلوم نہیں، مگر یقین ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے آخر میں ان کا انتقال ہوا، شیخ عبد اللطیف عبد الہادی مٹھن پوری[1] دیوان محمد رشید کے مشاہیر خلفاء میں ہیں، آپ شیخ محمد ارشد بن دیوان محمد رشید کے خسر بھی تھے، نظام آباد (اعظم گڈھ) کے قریب مٹھن پور میں رہتے تھے، میر سید قیام الدین سگڑی (اعظم گڈھ) بھی دیوان صاحب کے خلفاء میں شامل ہیں، آپ بعد میں گورکھپور جاکر مقیم ہوگئے تھے، حضرت دیوان محمد رشید کے خلفاء میں ان تینوں حضرات کا تعلق موجودہ ضلع اعظم گڈھ کے علاقہ سے باہر رہا ہے اور ان کے واسطے سے آخری دور میں راجگان چشتیہ گردیزیہ اور دیوان محمد رشید کا سلسلہ ادھر زیادہ پھیلا۔

راجگان گردیزیہ کا دنیاوی جاہ و جلال

اللہ تعالیٰ نے ساداتِ گردیزیہ کو دنیا و آخرت دونوں کے حسنات سے نوازا تھا

[1] سماتُ الاخیار ص ۹۳

مانک پور اور جونپور دونوں مقامات پر ان کو نہایت مناسب حالات ملے، اور انھوں نے امیرانہ وحاکمانہ لباس کو گلیم فقیرانہ بنایا، اور صدیوں تک شاہی میں فقیری کی، سید شہاب الدین گردیزی کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مانک پور آکر جاگیردار بنے اور منصب شاہی سے نوازے گئے، اور عوام و خواص میں راجہ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، شاہ عبد الحق دہلوی لکھتے ہیں کہ

"بزرگان ایشان معزز و مکرم بودہ اند، و در زبان مردم آں دیار برایشان اسم راجی غالب آمدہ" (اخبار الاخیار ص ۱۹۴)

مولانا محمد علی قلندر، انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں لکھتے ہیں کہ

"راجہ بزبان ہند شاہ را گویند، وسید حامد شاہ را راجہ می گفتند بطریق تعظیم بلاحظہ آنکہ آبائے کرام ایشاں ریاست مانک پور می داشتند۔" (ص ۱۰۲)

مشائخ گردیزیہ ریاست و امارت کی وجہ سے اس زمانہ کے موافق سپاہیانہ لباس پہنتے اور اسلحہ بند رہتے تھے، چنانچہ سید شہاب الدین کے بعد ان کے دونوں صاحبزادے سید شرف الدین اور سید عزالدین اسی لباس میں رہا کرتے تھے، راجہ سید حامد شاہ اور ان کے صاحبزادے راجہ سید نور شاہ کے بارے میں بھی اس کی تصریح ملتی ہے،

مانک پور آنے کے بعد ان کے دنیاوی حالات اور بہتر ہوگئے، اور مانک پور سے لیکر جونپور تک ان کی جاگیریں، زمینداریاں اور معافیاں پھیلی ہوئی تھیں، آئینۂ اودھ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سادات گردیزیہ کی عظمت ولیاقت کی وجہ سے سلاطین جونپور نے بھی ان پر توجہ کی، ابتداً یہ لوگ زمینداری و معافی اور دامغانیوں کی متروکہ ملکیتوں سے نوازے گئے، اسکے بعد علی قدر المراتب عہدہائے جلیلہ پر ممتاز کیے گئے، اور تھوڑے عرصہ میں پوری تحصیل گونڈہ، جس میں چار پرگنے تھے اور نصف تحصیل سلون پر جس میں دو پرگنے تھے، بطور زمینداری و معافی کے قابض ہوگئے، اور فرخ سیر

کے زمانہ ۱۱۳۰ھ تک برابر ترقی پاتے رہے، اور ان کی اولاد اتنی پھلی پھولی کر پانچ گاؤں ان سے آباد ہوگئے، مانک پور، بازید پور، رسول پور، اونچہ گانوں، اور مصطفےٰ آباد (ص ۱۶۷ و ۱۶۸)

بلاد پورب، اور ان کی عظمت کے تین ادوار مشائخ گردیزیہ کے بلاد پورب سے دینی، علمی، روحانی اور تعمیری تعلقات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ خود بلاد پورب کے حدود اور ان کے دور عظمت میں مختلف حکومتوں کے ادوار کو سمجھ لیا جائے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان میں ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ پورب دہلی سے مشرق میں ایک وسیع ملک ہے، جو صوبۂ الہ آباد، صوبۂ اودھ اور صوبۂ عظیم آباد پر مشتمل ہے، صوبہ ایک وسیع محدود علاقہ کو کہتے ہیں، جس میں دار الامارت ہوتا ہے، اور دوسرے شہر اس کے ماتحت ہوتے ہیں، ہر شہر سے متعلق قصبات ہوتے ہیں، اسی طرح ہر قصبہ سے متعلق قریات و دیہات ہوتے ہیں، اور پورب کے قصبات شہروں کے حکم میں ہیں، کیونکہ وہ عالیشان عمارات، امراء و شرفاء کے محلات اور مشائخ و علماء پر مشتمل ہوتے ہیں، اسی طرح ان میں مختلف قومیں قسم قسم کی صنعتیں، مساجد، مدارس اور عبادت خانے ہوتے ہیں، وہاں کی مسجدیں جمعہ و جماعات سے معمور ہوتی ہیں، اور ان پر شہر کا اطلاق صحیح ہوتا ہے،[۱]

پورب اور قصبات پورب میں اس دینی، علمی، روحانی اور تعمیری شان و شوکت کی ابتدا جونپور کے سلاطین شرقیہ کے ابتدائی زمانہ ۷۹۶ھ سے شروع ہوئی، اور لودھیوں کے دور سے گذرتی ہوئی آخری تیموری بادشاہ محمد شاہ عالم کے وقت میں ۱۱۳۰ھ میں ختم ہوگئی، بلاد پورب کی اس تقریباً ۳۳۴ سالہ بزم علم و فضل میں دوسرے بہت سے علمی اور روحانی خانوادوں کی طرح مانک پور کے گردیزی خواجگان چشت نے بھی اپنے سوز و ساز سے گرمیٔ محفل پیدا کی،

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۳۳

جونپور میں سلاطین شرقی کا دور حکومت سلطان محمد بن فیروز شاہ نے اپنے ایک خواجہ سرا سرور نامی کو خواجۂ جہاں کا خطاب دیا تھا، جسے سلطان محمد بن محمد بن فیروز شاہ نے سلطان الشرق کا خطاب دے کر ۷۹۶ھ میں جونپور کا حاکم بنایا، اس نے فیروز شاہی دور کے انحطاط کے زمانہ میں اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر دیا، اور مغرب میں دہلی کے پرگنہ کول (حدود علی گڑھ) سے لے کر مشرق میں بہار اور ترہٹ تک قبضہ کر کے پرگنہ کول، اٹاوہ، کپیلہ اور بہرائچ کے سرکشوں کو زیر کیا، اور لکھنوتی (بنگال) کے حکام کی طرف سے وہ تحائف و ہدایا جو کئی سالوں سے بند تھے، جاری کرائے،[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جونپور کی شرقی سلطنت مغرب میں پرگنہ کول تک، مشرق میں بہار اور ترہٹ تک اور شمال میں بہرائچ تک تھی، مانک پور بھی اس میں شامل تھا، سلطان الشرق خواجہ ۸۰۲ھ میں فوت ہوا،

جونپور میں حسب ذیل چھ سلاطین شرقیہ ہوئے ہیں:

(۱) سلطان الشرق خواجۂ جہاں سرور از ۷۹۶ھ تا ۸۰۲ھ،
(۲) سلطان مبارک شاہ شرقی۔ از ۸۰۲ھ تا ۸۰۴ھ،
(۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی از ۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ،
(۴) سلطان محمود شاہ شرقی از ۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ،
(۵) سلطان محمد شاہ شرقی از ۸۶۲ھ تا ۸۶۲ھ،
(۶) سلطان حسین شاہ شرقی از ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ،

سلاطین شرقیہ جونپور کے تقریباً ۸۵ سالہ دور سلطنت میں سلطان ابراہیم شرقی کا چالیس سالہ دور سلطنت کا عہد زریں ہے، ہر طرف سے علماء و صلحاء اور ارباب علم و فن کھنچ کھنچ کر

---

[۱] طبقات اکبری ص ۲۷۵، از مولانا نظام الدین احمد بن مقیم ہروی

جونپور آنے لگے، اور سلطان ابراہیم شرقی کے دار العلم اور دار الامان میں بیٹھکر بلاد پورب کے اس مرکز کو دہلی ثانی بنا دیا، طبقات اکبری میں ہے:

"بعد از فوت مبارک شاہ امرائے دولت شرقی برادر کہترا ورا سلطان ابراہیم خطاب دادہ برتخت سلطنت و اورنگ حکومت اجلاس نمودند، وطبقات انام در عہد امن وامان قرار گرفتند، علماء و بزرگان کہ از آشوب جہان پریشان خاطر بودند بجونپور کہ دران ایام دار الامان بود سر برآوردند، و آں دار السلطنت از قدوم علمائے دار العلوم گردید، و چندیں کتب و رسائل بنام او تصنیف شد، مثل حاشیہ ہندی، و بحر المواج، و فتاوی ابراہیم شاہی، و ارشاد وغیر ذلک"[1]

محمد قاسم فرشتہ نے سلطان ابراہیم شرقی کے دور سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"بعد از کوچ چند از راہ برگشتہ بدار العلم جونپور آمد، بصحبت علماء و مشائخ و تعمیر ولایت و تکثیر زراعت مشغول شدہ، سالہا بہیچ طرف سواری نفرمود، ومردم از اطراف واکناف ہندوستان کہ مشحون از خلل شدہ بود روئے جونپور آوردہ، ہر یک فراخور مرتبت وحالت نوازش یافتند، واز خادم مشائخ وسادات ونویسندہ از ہر حیثیت بجائے رسید کہ جونپور را دہلی ثانی می گفتند، ابراہیم شاہ شرقی را از جملہ مغتنمات شمردہ دو روزہ حیات را بنشاط و انبساط می گذرانیدند، از شاہ گرفتہ تا گدا بالتمام خوش وقت بودند و اندوہ از ان دیار بر بستہ بود"[2]

نویں صدی ہجری میں سلاطین شرقیہ کا دور پورب کے لیے صبح بہاراں تھا، گلستان علم و فضل کے پھول اپنی اپنی متاع رنگ و بو لیے جونپور آ گئے، جن میں یہ حضرات خلاصۃ الخلاصہ تھے،

[1] طبقات اکبری ص ۲۷۵ از مولانا نظام الدین احمد بن مقیم ہروی [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

شیخ حسام الدین مانک پوری (۸۵۳ھ)، شیخ فیض اللہ بن شیخ حسام الدین مذکور (۸۶۲ھ)، قاضی القضاۃ ملک العلماء شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی جونپوری ۸۴۹ھ، شیخ ابو الفتح بن عبد الحی بن عبد المقتدر شریحی کندی دہلوی ۸۵۸ھ، مولانا قاضی نظام الدین احمد بن محمد گیلانی جونپوری ۸۷۴ھ، قاضی تاج الدین ظفر آبادی ۸۸۱ھ، شیخ احمد بن عمر ردولوی ۸۳۶ھ، شیخ اجمل بن امجد جونپوری ۸۶۴ھ، شیخ اسمٰعیل بن صفی الدین ردولوی ۸۶۰ھ، شیخ اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی ۸۰۸ھ، شیخ رکن الدین بن صدر الدین جونپوری ۸۷۴ھ، شیخ رکن الدین ظفر آبادی کا ۸۲۰ھ، قاضی رضی الدین ردولوی، قاضی سماء الدین جونپوری ۸۹۴ھ، شیخ شمس الدین ظفر آبادی ۸۷۴ھ، مولانا عبد المالک جونپوری ۸۹۷ھ، مولانا شیخ محمد بن عیسی جونپوری ۸۷۴ھ، شیخ قطب الدین ظفر آبادی ۸۶۹ھ، مولانا قیام الدین ظفر آبادی ۸۱۷ھ، مولانا علاء الدین جونپوری، قاضی علامہ نصیر الدین جونپوری ۸۱۷ھ اور مولانا نور الدین ظفر آبادی ۸۲۶ھ وغیرہ رحمہم اللہ

جونپور پر سلاطین لودی کی حکومت

سلاطین شرقیہ جونپور کے آخری حکمران حسین شاہ شرقی نے کئی بار دہلی پر حملہ کیا، مگر ہر مرتبہ سلطان بہلول لودھی کے مقابلہ میں شکست کھائی، یہاں تک کہ بہلول شاہ نے ۸۸۱ھ میں جونپور پر قبضہ کرکے سلطنت شرقیہ کا خاتمہ کر دیا، اور جونپور کو دہلی کے ماتحت کرکے وہاں اپنا حاکم مقرر کیا، لودھی سلطنت میں حسب ذیل تین سلاطین گذرے ہیں، جنھوں نے جونپور پر بھی حکومت کی ہے۔

(۱) سلطان بہلول شاہ لودھی از ۸۵۵ھ تا ۸۹۴ھ

(۲) سلطان اسکندر بن بہلول لودھی از ۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ

(۳) سلطان ابراہیم بن اسکندر بن بہلول لودی از ۹۲۳ھ تا ۹۳۲ھ

بابر شاہ تیموری نے پانی پت کے میدان میں ۹۳۲ھ میں سلطان ابراہیم بن اسکندر بن بہلول لودھی کو قتل کرکے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا، لودھی سلاطین میں دوسرا حکمران اسکندر ابن بہلول لودی وہی حیثیت رکھتا تھا جو جونپور کے سلاطین شرقیہ میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی تھی، اس کا ۲۸ سالہ دور حکومت بہت ہی خیر و برکت میں گذرا، بڑا عادل، منصف، متقی و پرہیزگار، بیدار مغزی و حکمرانی میں اپنی مثال آپ تھا، علما و صلحا سے محبت کرتا تھا، ان کو اپنے دسترخوان پر بلاتا تھا، ان کی علمی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا، مدرسوں اور مسجدوں میں جاکر علما کا درس سنتا تھا، اس نے سرائیں، مسجدیں، مدرسے، اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، ملک کی آبادکاری کے لیے سڑکیں اور راستے بنوائے، پیداوار بڑھانے کی تدبیریں کیں، ہندی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے، ظہر بعد اور رات میں اپنے محل میں علما سے علمی مذاکرہ اور قرآن کریم کی تلاوت کرتا تھا، جب اس کے بھائی باربک شاہ نے جونپور میں فتنہ و فساد برپا کیا تو اسے فرو کرنے کے لیے سلطان خود جونپور گیا[1]، بہار و بنگال کی مہمات کے سلسلے میں سلاطین لودی جونپور آتے جاتے، اور یہاں قیام کرتے تھے، سلاطین لودی نے ۸۸۱ھ سے ۹۳۲ھ تک پچاس اکاون سال جونپور پر حکومت کی، سلطنت کے انقلاب و تغیر کا اثر ملک اور عوام و خواص پر پڑتا رہا، مگر ارباب علم و فضل کی بھری مجلس اپنی جگہ قائم رہی اور ارباب دین و دیانت ارباب اقتدار و سلطنت کی الجھنوں سے یکسو رہ کر اپنے کام میں مشغول رہے، اس دور میں جونپور کے سرآمد روزگار علما و فضلا میں ان بزرگوں کے نام سرفہرست ہیں: شیخ نظام الدین چشتی میران شاہ مانک پوری ۸۹۸ھ، سید احمد حسینی مانکپوری ۸۹۹ھ، راجہ سید حامد مانکپوری ۹۰۱ھ، مولانا شیخ الہداد جونپوری ۹۲۳ھ،

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۳۴ و ۳۵۔

مولانا شیخ بہاء الدین بن خلق اللہ جونپوری ۹۱۱ھ، شیخ حسن بن طاہر جونپوری ۹۰۹ھ، شیخ احمد ابن نظام الدین مانک پوری ۹۲۲ھ، شیخ احمد بن زین جونپوری ۹۶۳ھ، راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوری ۹۲۱ھ، مولانا خواجگی کڑوی ۸۹۵ھ، شیخ دتین بن احمد جونپوری ۹۴۴ھ، شیخ علی بن قوام الدین میر علی عاشقان سرائمیری ۹۵۵ھ، میر عدل شیخ محمود ابن شیخ حسام الدین مانک پوری ۹۰۵ھ، مولانا شمس الحق حنفی جونپوری ۹۵۰ھ، قاضی خان ظفرآبادی ۹۴۴ھ وغیرہ رحمہم اللہ،

سلاطین تیموریہ کا دور سلطنت ۹۳۲ھ میں جب بابر نے دہلی پر قبضہ کرکے ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد رکھی تو دیار پورب بھی تیموریوں کے تصرف میں آگیا، اس دور میں بھی یہ علاقہ ارباب علم و فضل سے معمور رہا، بلکہ اس کی محفل دوشین پھر سے سجائی گئی، اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ نئی آب و ہوا اپنے ساتھ تازہ بہار لائی ہے، تیموری سلطنت کے اقبال مند سلاطین حسب ذیل ہیں،

(۱) سلطان ظہیر الدین محمد بابر متوفی ۹۳۹ھ (۲) سلطان نصیر الدین محمد ہمایوں ۹۶۳ھ (۳) سلطان جلال الدین محمد اکبر ۱۰۱۴ھ (۴) سلطان نور الدین محمد جہانگیر ۱۰۳۶ھ، (۵) سلطان شہاب الدین محمد شاہ جہاں ۱۰۹۸ھ، (۶) سلطان محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر ۱۱۱۸ھ (۷) شاہ عالم محمد معظم بہادر شاہ ۱۱۲۴ھ

عالمگیر کے بعد اگرچہ اور کئی حکمران گذرے، مگر ان کی حیثیت تیموری دور بہار کے بے رنگ و بو پھولوں کی ہے، سلاطین تیموریہ میں شاہجہاں نے بلاد پورب کو بیت العلم والحکمت بنا دیا، اور اس خطۂ علم و حکمت اور بقعۂ یقین و روحانیت پر اس کو فخر تھا، فخر کیا کہ "پورب شیراز مملکت ماست"، اس سرزمین کو اگر سلاطین شرقیہ میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی

اور لودھی سلاطین میں سلطان سکندر اور بہلول جیسے علم پرور حکمراں ملے تھے، تو سلاطین تیموریہ میں شاہجہاں جیسا قدردان بھی پایا۔

علامہ غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں ملا نظام الدینؒ کے تذکرہ کے ضمن میں تیموری دور کے بلاد پورب کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے،

"ما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتی دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ تمام صوبہ اودھ واکثر صوبہ الہ آباد بر فاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کروہ، تخمیناً آبادی شرفا و نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند، و مساجد و مدارس و خانقاہا بنا نہادہ، و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بروئے دانش پژوہاں کشادہ، و صدائے اطلبوا العلم در دادہ، و طلبہ خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند، و صاحب توفیقاں ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند، و خدمت ایں جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند، صاحب قرانِ ثانی شاہ جہان انار اللہ برہانہ می گفت "پورب شیراز مملکت ماست"۔[1]

یہ اموی اور عباسی دور کے بغداد و دمشق کی داستان یا اندلس کے قرطبہ و اشبیلیہ کی کہانی نہیں ہے، بلکہ ہندوستان میں تیموری دور کے خطۂ پورب کی روداد ہے۔

تیموری دور حکومت میں خطہ پورب کی سرزمین پر آسمان علم و فضل کے چاند تارے اس کثرت سے جلوہ گر ہوئے کہ یہ پورا علاقہ دار العلم بن گیا، اس مدت میں یہاں بے شمار ارباب علم و فن گذرے، جن میں چند حضرات یہ ہیں:

مولانا الہداد جونپوری ۹۲۳ھ، اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے، مولانا رفیع الدین

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۱ و ۲۲۲

محدث شیرازی ۹۵۴ھ، شیخ معروف جونپوری، شیخ دانیال جونپوری ۹۹۲ھ، شیخ محمد بن حسن بن طاہر جونپوری ۹۹۴ھ، مولانا سید عبد الاول جونپوری ۹۶۸ھ شارح بخاری، استاذ الملک ملا محمد افضل ردولوی جونپوری ۱۰۶۲ھ، ملا محمود بن محمد جونپوری ۱۰۶۲ھ اپنے زمانہ میں پورے عالم اسلام میں علوم عقلیہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، شاہ دیوان محمد رشید (عبد الرشید جونپوری) ۱۰۸۳ھ، ملا ضیاء الدین محدث پھولپوری جونپوری، شیخ جندن محدث، قاضی محمد حسین جونپوری ۱۰۲۸ھ، شیخ محمد ماہ دیوگامی ۱۰۹۵ھ، ملا شمس الدین برونوی جونپوری ۱۰۴۷ھ، ملا نور اللہ جونپوری ۱۰۱۳ھ، ملا باب اللہ جونپوری، حضرت ملا احمد جیون امیٹھوی ۱۱۳۰ھ، شیخ محمد افضل سید پوری الہ آبادی ۱۱۲۴ھ اور دوسرے بہت سے ارباب علم و فن موجود تھے،

سرزمین پورب میں علم و فضل کا زوال و انحطاط

عہد تیموری میں جس سرزمین پورب کی سرسبزی و شادابی کا حال علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے بیان کیا ہے، اس کی تباہی و بربادی کی داستان بھی ان ہی کی زبان سے سنیے، وہ لکھتے ہیں کہ ۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین کی مٹی میں علم و علماء کی گرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم بنا، اور اس کے اکثر شہروں کو، نیز دار الخیر جونپور، بنارس، غازیپور کڑہ مانک پور، کوڑا جہان آباد، وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے قدیم و جدید خانوادوں کے وظائف اور جاگیرداریوں کو یکسر ضبط کر لیا جس کی وجہ سے شرفاء و نجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی، ان اطراف کے لوگوں کو معاش و معیشت کی الجھنوں نے کسب علم سے باز رکھ کر پیشۂ سپہگری میں ڈال دیا، اور تدریس و تحصیل کا رواج یوں ختم ہو گیا کہ عہد قدیم کا یہ معدن علم و فضل بالکل ویران ہو گیا، اور اکثر ارباب کمال کی بھری انجمنیں اکھڑ گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اور برہان الملک کے بعد اس کے ماموں زاد بھائی ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کو حکومت ملی، اس وقت بھی وظائف اور جاگیرداریاں بدستور ضبط رہیں، پھر جب محمد شاہ کے آخری عہد میں ۱۱۵۹ھ میں صوبہ الٰہ آباد کی صوبہ داری بھی صفدر جنگ کے حوالہ کی گئی، تو صوبہ الٰہ آباد کی رہی سہی جاگیریں اور وظائف بھی باقی نہ رہ سکے، اور اس نے ان کو بھی ضبط کر لیا، احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ وزیر اعلیٰ بن گیا، اور صوبہ کے نائب حاکم نے ارباب وظائف پر بڑی سختی کی، اس کے بعد سے ابتک یہ دیار پامال ہی ہے، لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔ مگر ان تمام خرابیوں کے باوجود اس علاقہ میں علم کا، خصوصاً معقولات کا رواج اس طرح سے ہے کہ پورے ہندوستان میں اور کسی جگہ نہیں ہے، ابھی تک علما، فحول جلوہ طراز رکھ مراتب کمال کی انتہائی بلندیوں پر ممتاز ہیں۔

" با صد جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائے ست

(مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲، ۲۲۳)

بزم تیموریہ

اس میں مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر اور تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امرا، شعرا، اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات کی تفصیل اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری اور ان کے کلام پر تبصرہ، اور غالب، میر تقی میر، ناسخ و آتش سے ان کے کلام کا موازنہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے)

قیمت :

معہ
منیجر

مکتوب قاہرہ

قاہرہ
۱۹ / دسمبر ۱۹۶۵ء

جناب مخدوم و محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی، علی گڑھ سے برادرم جناب معین الدین اعظمی نے آپ سے ملاقات اور کتابوں کے سلسلہ میں آپ سے گفتگو کا ذکر کیا تھا، اس کے بعد دار المصنفین سے پارسل کا انتظار رہا، ابھی ایک ہفتہ پہلے پارسل پہنچا، آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ، آپ کو یہاں سے جن کتابوں کی ضرورت ہو مطلع فرمائیں، میں یہ خدمت اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھونگا، میں نے سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم کا ترجمہ مکمل کر کے ڈیڑھ سال پہلے وزارت ثقافت میں پیش کر دیا ہے، وزارت والوں نے اردو عبارت کی مراجعت کے لیے ایک قدیم ہندوستانی مقیم قاہرہ اور سابق اردو پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی جناب شیخ نعمان صدیقی کے سپرد کیا تھا، ان کی مراجعت کے بعد پھر ترجمہ یہاں کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر یحییٰ الخشاب کے پاس عربی اسلوب کی مراجعت کے لیے بھیجا گیا، انھوں نے بھی اپنا کام مکمل کر دیا، اب آراء و افکار کی مراجعت کے لیے ازہر کے ایک مشہور مولانا " الشیخ عبد المتعال الصعیدی " کے پاس بھیجا ہے، وہ ابھی ترجمہ پڑھ رہے ہیں، ان کے پڑھنے کے بعد ہی کتاب چھپے گی۔

باقی میری دوسری کتاب " العلاقات الثقافیۃ بین الہند و البلاد العربیۃ منذ اقدم العصور "

کو مصر کی وزارتِ تعلیم عالی عنقریب چھپوا رہی ہے، عموماً مصر کے دفاتر میں کام بہت سست ہوتے ہیں، اس وجہ سے بھی تاخیر ہو گئی، اور دوسری وجہ یہ ہوئی کہ یہاں آجکل کاغذ کا بڑا قحط ہے، یہاں کے اخبارات نے بھی اپنے کچھ صفحات گھٹا دیے ہیں، انہی وجوہ کی بنا پر کتابوں کا جلد چھپنا دشوار ہے،

میں نے الحافظ ابن عبد البر کی کتاب "الاستذکار فی مذاہب علماء الامصار" کے ایک بڑے حصہ کی تحقیق کر لی ہے، مگر اس کا مکمل نسخہ ابتک دستیاب نہیں ہوا، یمن، قاہرہ، لندن وغیرہ کے قلمی نسخے جمع کر لیے ہیں، یہ کتاب موطا مالک کی شرح ہی نہیں بلکہ مذاہبِ اربعہ پر اسلامی تاریخ میں پہلی کتاب ہے، اسی کے نہج پر ابن رشد نے بدایۃ المجتہد لکھی ہے، چونکہ میں نے "ابن عبد البر واثرہ فی الحدیث والفقہ" پر قاہرہ یونیورسٹی میں ایم، اے کا مقالہ پیش کیا تھا، اس لیے اس موضوع پر بہت حاوی ہوں، مگر افسوس کہ کتاب کا نسخہ مکمل نہیں ہے، اس لیے اس کام کو ملتوی کر دیا اور "الموسوعۃ القرآنیۃ" کے نام سے حروفِ ابجدی کے مطابق قرآن کی تاریخی، جغرافیائی، فقہی حیثیت اور اسکے اسماء، اور حیوانات و نباتات وغیرہ پر قدیم و جدید تحقیقات کی روشنی میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں، اس سلسلہ میں کافی مواد جمع کر لیا ہے، خصوصاً عاد و ثمود کے سلسلہ میں جدید تحقیقات کی روشنی میں نئے نئے نتیجے پر پہنچا ہوں، اس سلسلہ میں انگریزی میں اچھی اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اسی طرح قدیم مصری تاریخ و تمدن پر عربی اور انگریزی میں کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان سب سے استفادہ کیا ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے نصف صدی پہلے "ارض القرآن" میں اپنے دور تک کی تمام تحقیقات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اب واقعی آپ کے پچھلے خط کے مطابق بیشمار نئی باتیں سامنے آگئی ہیں، خود عراق کے ایک مشہور مورخ

ڈاکٹر جواد علی کی کتاب "تاریخ العرب قبل الاسلام" جو ۱۹۵۲ء میں چھپی، "ارض القرآن" پر خاصا اضافہ ہے، بائبل پر بھی جدید تحقیقات کی روشنی میں کافی معلومات جمع کی ہیں، عہد قدیم کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ مصر آئے تھے، اور حضرت موسیٰؑ کا قصہ بھی معروف ہے، مگر فراعنہ کی تاریخ میں ان کا ذکر ہی سرے سے نہیں ہے، مگر میں نے بڑی محنت و تلاش کے بعد انہی کتابوں سے یہ چیزیں بھی جمع کر لی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ بڑی خدمت لے لی تو میں اس کو اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

قاہرہ کی عین شمس یونیورسٹی میں عنقریب پی، ایچ، ڈی کا تھیسس پیش کر رہا ہوں، میرا موضوع ہے "المعاجم العربیۃ فی الهند تاریخها ومناهجها" دراسۃ مقارنۃ۔ اس سلسلہ میں پہلی دفعہ الصغانی کی "العباب الزاخر، التکملہ اور مجمع البحریہ پر مکمل تحقیق و بحث کی ہے، ان سب کتابوں کے قلمی نسخے قاہرہ میں موجود ہیں، الصغانی کی زندگی اور اسکے علمی کارناموں پر مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی کا مضمون کئی قسطوں میں جنوری ۱۹۵۹ء سے معارف میں شائع ہوا ہے، میرے پاس صرف اس کے دو عدد یعنی جنوری اور مارچ کے موجود ہیں، براہ کرم اگر یہ پورے پرچے بھجوا دیں تو بڑی عنایت ہو گی، مستقل طور پر "معارف" بھی میرے نام جاری کرا دیں، اور بحری ڈاک سے میرے پتہ پر روانہ کرنے کا انتظام فرما دیں۔

آپ کو جن جن کتابوں کی ضرورت ہو فوراً لکھیں، انشاء اللہ کچھ نئی کتابیں اور قاہرہ کے مختلف مکتبوں کی فہرستیں آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ روانہ کر رہا ہوں، محترم جناب صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی کتابیں ہندوستان کی اسلامی تاریخ

وتمدن پر بہت مفید ہیں، انہی کتابوں کی مدد سے "حکومت کویت" کے مشہور عربی رسالہ "العربی" میں جولائی اور دسمبر ۱۹۶۵ء کے پرچوں میں میرے دو مضامین "السفارات الاسلامیۃ بین الہند والبلاد العربیہ فی القرون الوسطیٰ" اور "المرأۃ المسلمۃ فی الہند" شائع ہوئے ہیں، شاید یہ رسالہ ہندوستان میں کویت کے سفارت خانہ سے آپ کے ہاں پہنچتا ہوگا، یہ عرب ممالک کا بہت مشہور رسالہ ہے، اور اس کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے، اب عنقریب ایک تیسرا مضمون "اردو ادب" پر اسی رسالہ میں شائع ہوگا، اور اس میں مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ تعالیٰ کی شخصیت اور انکی خدمات پر کافی لکھا ہے،

دوبارہ آپ کی کتابوں کا شکریہ، ا.. امید ہے کہ معارف کے پرچے روانہ کرکے مشکور فرمائیں گے۔

والسلام

محمد اسماعیل الندوی

ادب، شارع السباق

مصر الجدیدہ، القاہرہ

U.A.R

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے غلام سلاطین، ان کے امرا اور شہزادوں کی علم نوازی اور اس دور کے علماء وفضلاء وشعراء مثلاً بہاء الدین اوشی، مولانا شہاب سراج، شمس دبیر وغیرہ کے علمی وادبی کارناموں پر نقد وتبصرہ، خصوصاً اس دور کے ممتاز وسرآمد روزگار شعرا رزہ، شہاب اور عمید کا تعارف اور ان کے کلام کا انتخاب،

قیمت: ۵ روپے ۵۰ نئے پیسے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

حدود العالم من المشرق الی المغرب

مصنف نامعلوم، مرتبہ ڈاکٹر منوچہر ستودہ، صفحات ۲۵۵، ٹائپ اعلیٰ، ناشر تہران یونیورسٹی۔

علم جغرافیہ ایک قدیم فن ہے، مگر مسلمانوں نے اسے بڑی ترقی دی اور اس موضوع پر انھوں نے سیکڑوں کتابیں لکھیں، خاص طور پر تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اس فن پر بہت زیادہ کام ہوا، ان مصنفین نے زمین کی آبادی، اس کے طبعی حالات اور اس کے سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں، نیز آب وہوا اور موسم اور اس کے تغیرات کے بارے میں ایک ہزار برس پہلے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان میں بنیادی طور پر بہت کم اضافہ ہو سکا ہے، زمین کی مسافت اور گولائی اور اس کے دوائر وغیرہ کے بارے میں جو باتیں ان قدیم کتابوں میں درج ہیں ان کو پڑھکر تعجب ہوتا ہے کہ ذرائع اور آلات کی کمی کے باوجود انھوں نے کس طرح یہ معلومات فراہم کی ہیں، انہی پر معلومات کتابوں میں زیر تبصرہ کتاب بھی ہے۔ شروع کتاب میں زمین کی گولائی، اس کے دائروں، جزیروں، سمندروں، خلیجوں، صحراؤں، پہاڑوں وغیرہ کی تفصیل ہے، پھر اس کے مختلف ملکوں اور خطوں کے طبعی وجغرافیائی حالات بیان کئے گئے ہیں، ڈاکٹر منوچہر نے بڑی محنت سے اسکو مرتب کرکے شائع کیا ہے، البتہ پوری تحقیق کے باوجود مصنف کے نام کا پتہ نہیں چل سکا، ممکن ہے کہ آئندہ کوئی سراغ لگ سکے، کتاب کی زبان فارسی ہے اور سنہ تصنیف ۳۷۲ھ ہے، اس کی اشاعت تہران یونیورسٹی کی طرف سے ہوئی جس پر وہ مبارکباد کی مستحق ہے۔

نقطۂ نظر

از عبد المغنی صاحب، تقطیع ... صفحات ۱۲۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴، قیمت صہ

عبد المغنی صاحب ایک اچھے نثر نگار اور متوازن نقاد ہیں، انھوں نے بہت سے تنقیدی مضامین لکھے ہیں، جن میں سے چند اس مجموعے میں شامل ہیں، اس میں کل ۱۴ مضامین ہیں، اور ہر مضمون پر معلومات اور مطالعہ کے لائق ہے، ادب و زندگی کے تعلق کی بحث نئی نہیں ہے، مگر اس موضوع پر لکھنے والوں نے عام طور پر انتہا پسندانہ رائے قائم کی ہے، یا تو ناقدین کا قلم جارحانہ ترقی پسندی کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر ادب برائے تفریح یا انارکیت کی تبلیغ میں لگ جاتا ہے، عبد المغنی اس بارے میں اعتدال پسند نظر آتے ہیں، اور ان کا ہر مضمون اس اعتدال پسندی کا آئینہ دار ہے، ادب میں ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ان کے یہ چند جملے کافی ہوں گے:

"میرے خیال میں انسان کی زندگی کسی حیوانی ارتقا کا نتیجہ نہیں، یہ الوہی تخلیق کا نتیجہ ہے، چنانچہ آدمی طبعاً ایک ذمہ دار اور شریف مخلوق ہے، انسانی سماج کی ترقی جنسی یا معاشی کش مکش کی مرہون منت نہیں، یہ ترقی سراسر اخلاقی تعاون کا عطیہ ہے، یہ تعاون مثبت اجتماعی قدروں کے ایک نظام پر مبنی ہے"

امید ہے کہ ان کا یہ اعتدال پسندانہ ادبی نقطۂ نظر سنجیدہ طبقہ میں قبولیت حاصل کریگا اور اردو ادب کے بہت سے سنجیدہ ادباء کے اشہب قلم کے لیے یہ مجموعہ مہمیز ثابت ہوگا، یوں تو کتاب کا ہر مضمون مطالعہ کے لائق ہے، مگر اقبال اور شخصیتیں اور احتشام حسین کی تنقید نگاری وغیرہ مضامین ان کے قلم کا شاہکار ہیں،

اردو کا پہلا ناول۔ از مولوی کریم الدین، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب، صفحات ۱۶۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر دانش محل، لکھنؤ، قیمت ۳ر

اردو میں قصہ نگاری کی باقاعدہ ابتدا انیسویں صدی سے ہوئی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور ڈپٹی نذیر احمد کی مرآۃ العروس ہے، مگر مولوی کریم الدین کی خط تقدیر کو مرآۃ العروس پر کئی برس کا تقدم

حاصل ہے، یہ کتاب شائع ہوتے ہی کئی جگہ کورس میں داخل ہوگئی اور بہت مقبول ہوئی، گارساں دتاسی نے اردو میں قصہ نگاری پر بڑی سخت سخت تنقیدیں کی ہیں، مگر اس نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ یہی نقوش اولیں اردو میں افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی بنیاد بنے، مولوی کریم الدین نے اس میں محض روایتی انداز میں قصہ نگاری نہیں کی ہے، بلکہ انھوں نے اپنے دور اور خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پیدا ہونے والے مسائل اور حالات کا جائزہ بھی لیا ہے اور اس پر روشنی ڈالی ہے، دلی کالج نے اردو ادب کی ترویج کے لیے جو مقاصد متعین کیے تھے، ان کی تکمیل میں دوسروں کے ساتھ مولوی کریم الدین نے بھی پورا حصہ لیا، اہل علم میں ان کی اصل شہرت ان کے تذکرے کی وجہ سے ہے، اور طلبہ میں وہ اپنی کریم اللغات کی وجہ سے مشہور ہیں، شروع کتاب میں مرتب کے قلم سے ایک پر معلومات مقدمہ ہے، بہرحال اس کی اشاعت ایک لائق تحسین ادبی خدمت ہے۔

حرکت آفاق (فارسی)۔ از حبیب اللہ پالنپوری، صفحات ۱۱۰، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، جامع مسجد دہلی ۶، قیمت ۲ر

حبیب اللہ پالنپوری ایک کہنہ مشق اور معروف شاعر ہیں، ان کے اردو مجموعۂ کلام پر اس سے پہلے تبصرہ ہو چکا ہے، یہ ان کا فارسی مجموعۂ کلام ہے، ان کو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے مگر خاص طور پر ان کے فارسی کلام پر تو اقبال کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، ترکیبوں کی چستی، روانی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ حکمت و دانائی سے ان کا ہر شعر پر ہے، ان کے چند شعر ضیافت طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں،

اے شہابِ گنبدِ نیلوفری — اے حنا، رنگ و بوے عبہری

در تلاشِ نرگسِ شہلاستم — من شہیدِ لالۂ حمراستم

گاہ در باغ و خیابان و چمن — گاہ در راغ و بیابان و دمن

گہ یکے آوارۂ صحراستم — بار دیگر بر لبِ دریاستم

چوں ارسطو شیشہ بازی می کنم | چوں سکندر ترکتازی می کنم
از سخن آئینہ سازی می کنم | خضر ہستم خاکبازی می کنم
ایں سکندر ایں ارسطو ایں خضر | بر در تو آمد ند آئینہ گر
فلسفی در خاکدان کوہ و کاہ | بے خبر از آہ با دانائے راہ

یہ مجموعہ ہر صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

حیات و کائنات - از ڈاکٹر سید عبد المجید شمس عظیم آبادی پرنسپل کالج آف کامرس پٹنہ،

صفحات ۹۴، کتابت وطباعت اعلیٰ، ناشر سائنٹفک پبلشرز، مجید ولا، پٹنہ ۴، قیمت للعہ

ڈاکٹر سید عبد المجید صاحب شمسؔ کو شعر و شاعری کا ستھرا ذوق ہے، گو ان کے مشاغل اس کی اجازت کم دیتے ہیں مگر ان کا فطری ذوق اس کے لیے وقت نکال ہی لیتا ہے، اسی ذوق کی تسکین اس مثنوی کے ذریعہ انھوں نے کی ہے، اس میں انھوں نے کائنات کے الٰہی ارتقاء، اور انسانی زندگی کے تمدنی و تاریخی ارتقا کی نظم کی زبان میں تفصیل کی ہے، اردو میں مثنوی لکھنے کا رواج اس کے عہد آغاز ہی سے ہے مگر فطری علمی اور اخلاقی اور تمدنی ارتقاء کے نازک مسائل کو ایک مسلسل نظم اور مثنوی میں ادا کرنا بڑا مشکل کام ہے، لیکن شمس صاحب نے اس کی نزاکتوں سے پورے طور پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔

مثنوی کی ایک ہی بحر اردو میں رواج پذیر ہے، اسی بحر میں یہ مثنوی بھی لکھی گئی ہے، اس سطحی اور صحافی ادبی دور میں یہ ایک سنجیدہ کوشش ہے، جو ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے۔

"م - ع"

جلد ۹۷- ماہ شوال المکرم ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۶ء - عدد ۲

مضامین